آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

# خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

ستمبر 2020

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

# ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

## ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے    سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

اردو آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ
# خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد:4 شمارہ:9 ستمبر 2020

**مدیر اعلیٰ** : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

**مدیر منتظم** : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

**مشیر** : ڈاکٹر مسرت

## ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع : ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی- 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

## صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

## شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066
فون : 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد- 500002
فون: 24415194 - 040

# اس شمارے میں


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | مشعل | مدیر | 4 |
| روبرو | ناصرہ شرما سے ایک ملاقات | زیب النساء | 5 |
| شخصیت | خدیجہ مستور کا سیاسی وسماجی شعور | ڈاکٹر عرش کاشمیری | 9 |
| نکہت سخن | شاعرات کے منتخب اشعار | | 14 |
| جہان نسواں | اردو شاعری میں استاد کی اہمیت | ڈاکٹر فرزانہ خلیل | 15 |
| | مروّت کا چراغ: ڈاکٹر محمد کلیم ضیا | ڈاکٹر قیصر جہاں سیط اللہ | 18 |
| | میرال الطحاوی کا ناول 'خیمہ' | ابرار احمد اجراوی | 21 |
| | قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں مشترکہ تہذیبی عناصر | محمد شفیع بھٹ | 26 |
| | اردو ذریعہ تعلیم میں سماجی علوم کی تدریس کے مسائل اور امکانات | ثنا شمشاد صدیقی | 29 |
| کہانیاں | خوشبو کا سفر | رخشندہ روحی مہدی | 33 |
| | مجبوری | مینا خان | 39 |
| | کنگن | ڈاکٹر مسرور صغریٰ | 42 |
| حسن سخن | شیبا کوثر، شبانہ عشرت | | 48 |
| باورچی خانہ | لذیذ پکوان | | 51 |
| صحت | انفلوئنزا | حسین فاروقی | 53 |
| آرائش وزیبائش | حسن کی نگہداشت | | 57 |
| تاثرات | تاثرات نگر نگر سے | | 59 |
| خواتین خبرنامہ | | | 61 |

# مشعل

اساتذہ ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ملک و قوم کی آبیاری کرنے اور طلبہ کی ذہن سازی کرنا استاد کا بنیادی کام ہوتا ہے۔

پوری دنیا میں معلمی کے پیشے کو عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس پیشے کی اپنے آپ میں بہت اہمیت ہے۔ اساتذہ زندگی کی مشکل شاہراہوں پر طلبہ کو چلنا سکھاتے ہیں۔ خواہ کیسی بھی صورتحال ہو استاد شاگرد کی زندگی میں اہم رول ادا کرتا ہے اور اسے زندگی کے ہر میدان میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے کے لیے ہمیشہ رہنمائی کرتا ہے۔

طلبہ کی مناسب تربیت اور ذہن سازی استاد کا بنیادی مقصد ہے۔ نسل نو کی تربیت کے بغیر اور ان کی ذہن سازی کے بغیر کوئی بھی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ اسی لیے اساتذہ کا بنیادی کام ان کے اندر ان صفات کا پیدا کرنا ہے جو ان کو ایک اچھا انسان بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں بھی معاونت کرسکے۔

نئی نسل کے اندر بھی بے پناہ صلاحیتیں اور قوتیں موجود ہیں۔ ان صلاحیتوں کو پہچاننے کی شدید ضرورت ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل ادب کو چاہیے کہ وہ اپنے شاگردوں کی تربیت کریں اور ان کے فن کو نکھارنے کی کوشش کریں۔ اگر ضرورت پڑے تو غلطی پر ان کو خبردار کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خوبیوں کی تعریف بھی کی جائے۔ ان کے اندر لکھنے پڑھنے کا سلیقہ پیدا کیا جائے۔ ان پر انفرادی طور پر کچھ خاص توجہ کی جائے اور نئی نئی صفات سے ان کو مزین کیا جائے۔ اگر ہم ان کے اندر بیداری کے ساتھ ساتھ ان میں شعور و آگہی پیدا کریں تو اس سے قوم کو بہت فائدہ پہنچے گا اور مستقبل کو حال سے بھی زیادہ تابناک اور روشن بنایا جاسکتا ہے۔

آج مختلف علاقوں اور مرکز میں خواتین کی ایک کثیر تعداد معلمی کے پیشے سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ بات ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ اس موقع پر ہمیں اپنی پہلی معلمہ ساوتری بائی پھولے کو نہیں بھولنا چاہیے کہ انھوں نے کتنی محنت سے خواتین اور لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں ایک لڑائی لڑی اور اس کو فتح میں بدلا۔ جس زمانے میں ساوتری بائی پھولے نے خواتین کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا اس زمانے میں یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ساوتری بائی پھولے کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کی معاون ثنا شیخ کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دونوں کا منشا ایک ہی تھا۔ ساوتری بائی پھولے نے لڑکیوں کے لیے اسکول کھولا۔ نہ صرف اسکول کی تعمیر کروائی بلکہ پورے انہماک اور محنت سے خواتین کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کی۔ اس عمل کی وجہ سے ان کو بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے خواتین کی تعلیم کے لیے بہت سی اذیتوں کو بھی سہا لیکن ان کے پایۂ استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔ ساوتری بائی پھولے اور ثنا شیخ جیسی خواتین کی آج شدید ضرورت ہے جو ایماندارانہ جذبے کے ساتھ نسل نو کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی پوری ایمانداری اور سچے جذبے کے ساتھ کرسکیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

# ناصرہ شرما سے ایک ملاقات

زیب النساء

س: آپ کا آبائی وطن؟

ج: ہم لوگ ضلع رائے بریلی کے ایک گاؤں مصطفیٰ آباد کے رہنے والے ہیں۔

س: آپ کے والدین کہاں کے رہنے والے تھے؟

ج: والدہ ہماری کلکتہ کی تھیں اور والد صاحب رائے بریلی کے۔

س: آپ کی موجودہ مشغولیات کیا ہیں؟

ج: زندگی تو ہر موڑ کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ پہلے یہ تھا کہ گھومنا، پھرنا، لکھنا پڑھنا اور سوشل ایکٹی وٹی بھی رہتی تھی۔ اس کے بعد ٹریولنگ تھوڑی کم ہوئی۔ اس کے علاوہ رائٹنگ ہے۔

س: آپ کی پسندیدہ نظم یا اشعار کون سے ہیں؟

ج: ایک زمانہ تھا جب ہم شعر رٹتے تھے اور بیت بازی ہوتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ مجھے ایسا لگا کہ ہمارے وقت کی ضرورت شاعری نہیں ہے۔ نثر بھی ہے۔ میرا جھکاؤ نثر کی طرف بہت ہے کیونکہ میرے اجداد شعرا رہے ہیں۔ کہیں تو خون میں ہے ہی۔ میں شاعری پڑھتی تو بہت ہوں۔ بشیر بدر کی شاعری کو پسند کرتی ہوں۔ ندا فاضلی کو بھی میں پڑھتی ہوں۔

س: آپ کی پسندیدہ فلمیں کون سی ہیں؟

ج: فلمیں تو بکھری بکھری ہیں۔ مجھے تو ایک انگریزی فلم بہت زیادہ پسند ہے۔ ''ڈاکٹر ژواگو'' ہندی میں بھی بے شمار ہیں۔ نام لینا مشکل ہے۔

س: آپ نے جو کتابیں پڑھیں ہیں ان میں کن کن کتابوں سے زیادہ متاثر ہیں؟

ج: بچپن میں بہت زیادہ متاثر تھی واجدہ تبسم اور کرشن چندر سے اور خواجہ احمد عباس کا ''گلشن'' جو نکلتا تھا، میں فدا تھی اس پر۔ اس میں بے شمار چیزیں پڑھی میں نے۔

س: ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور اہل مذاہب کے باہمی بہتر ربط و تعلقات کو آپ کس قدر ضروری سمجھتی ہیں؟

ج: بے حد ضروری ہے۔ اتنا ضروری ہے کہ میں بتا نہیں سکتی ہوں۔ آپ خود ہی دیکھیں کہ کئی دفعہ ہمارا ماحول بگڑا ہے۔ ہم بے چین ہوتے ہیں۔ ہمارا جو تانہ بانہ ہے، اس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بہت سے بزرگوں نے اپنی محنت اور زندہ دلی سے اس کو بنایا تھا۔ آج اس میں پھر سے ایک نئی روح پیدا ہوئی ہے اور تمام مذاہب کے لوگوں نے مل کر یہ دکھا دیا ہے کہ ہماری تہذیب الگ ہونے کے بعد بھی ہم سب ایک خوبصورت تہذیب کا نمونہ ہیں۔

س: ہندوستانی خواتین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آزادی کے بعد سے ان کی حالت بہتر ہوئی ہے؟ ان میں مزید بہتری

لانے کے لیے کن اقدام کو اٹھانے کی ضرورت ہے؟

**ج:** جی ہاں، ہمارے ہندوستان کی خواتین میں آزادی کے بعد حالات بہتر بہت ہوئے ہیں۔ آج آپ دیکھیں کہ ہماری مسلم خواتین زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کر رہی ہیں۔ وہ صرف گھریلو عورتیں ہی نہیں، بلکہ ہر مقام پر انھوں نے اپنا نام روشن کیا ہے اور اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

**س:** خواتین کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے مضبوط کرنے، بااختیار بنانے کے لیے جو کوششیں ہوتی ہیں وہ کس قدر کامیاب رہیں؟

**ج:** کافی کامیاب رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

**س:** ہندوستان کی ممتاز خواتین جن کی تحریروں کو آپ نے پڑھا ہے؟ وہ کون ہیں؟

**ج:** بہت سی ممتاز خواتین کو پڑھا ہے۔

**س:** دوسرے ممالک کی تہذیبی اقدار اور کلچر سے کس قدر متاثر ہوئی ہیں؟ مشرقی اور مغربی ثقافت میں کیا فرق ہے؟ ہندوستانی ثقافت کیا ہے؟

**ج:** ہندوستانی تہذیب اب گھروں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ بول چال بدل گئی ہے، طریقے بدل گئے ہیں اور رکھ رکھاؤ بھی۔ اگر میں کہوں کہ دو جگہ سے میں بہت متاثر ہوئی۔ پہلا انگلینڈ جہاں میں نے دو طبقات دیکھے۔ ایک مزدور طبقہ دوسرا ایسا طبقہ تھا جو تعلیم یافتہ تھا اور وہاں کا جو دستور تھا اور قوانین تھے وہاں کے ماحول سے میں بہت متاثر ہوئی۔ دوسرا میں ایران گئی تو وہاں کے دستور قوانین نے بھی مجھے متاثر کیا۔

**س:** آزادی کے بعد ہندوستان میں خواتین کو سماجی اعتبار سے کیا کیا حقوق حاصل ہوئے یا اب بھی وہ محروم ہیں؟

**ج:** عورتوں کے لیے بہت قانون بنے ہیں۔ این جی او بھی بنے ہیں۔ نظریہ بدلا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہندوستانی عورت پوری طرح سے آزاد نہیں ہو پائی ہے۔ مسلمان عورت بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ اگر ہم 80% عورتوں کو دیکھیں تو وہ اوپر سے ضرور بدلی ہیں تعلیم یافتہ بھی ہوگئی ہیں سلیقے سے رہنے لگی ہیں۔ نوکری بھی کرنے لگی ہیں۔ لیکن صحیح معنوں میں لوگوں کے دلوں میں جو عزت ان کے لیے ہونی چاہیے اور جس طرح کی آزادی ان کو ملنی چاہیے وہ اب تک اس سے محروم ہیں۔

**س:** ہندوستان کے مختلف مذاہب میں خواتین کے حقوق کے بارے میں ایسی کون سی تعلیمات ہیں جن کو موجودہ سماج میں فروغ دیا جانا چاہیے؟

**ج:** جب میں جامعہ میں پڑھا رہی تھی تو وہاں ایک صاحبہ تھیں۔ ان کا نام تو مجھے یاد نہیں رہا لیکن میں نے کئی مضمون میں ان کا ذکر کیا ہے۔ جب ہم لوگ ملتے تھے تب ہم لوگوں کے دل میں بڑی تمنا تھی کہ کچھ کرنا ہے۔ تو ہم نے طے کیا کہ ہم محلے محلے جائیں گے اور بتائیں گے کہ طلاق کیا ہے؟ کیسے ہونا چاہیے؟ مہر کیا ہے؟ لیکن وہ بات بن نہیں پائی۔ میں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد جب شاہ بانو کا کیس ہوا اس سے پہلے ایک واقعہ میرے دوست کی بھانجی کے ساتھ ہوا۔ پہلی ہی رات میں لڑکی سے مہر معاف کرالیا گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں حیران رہ گئی۔ یہ سوچ کر کہ ہم لوگوں کو دنیاوی تعلیم تو دی گئی ہے لیکن ہمیں دینوی تعلیمات سے لاتعلق رکھا گیا ہے اور شریعت اور قانون سے واقف نہیں کرایا گیا۔ ان چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے شریعت کے قانون پڑھے اور ان سے متعلق بہت سی کہانیاں لکھیں۔

**س:** مسلم خواتین کی موجودہ پوزیشن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ان کی تعلیمی ترقی، معاشی خوش حالی کے تعلق سے آپ مطمئن ہیں؟

**ج:** مطمئن تو ہوں۔ چونکہ چاہے رفتار دھیمی ہو لیکن لگاتار ہو رہی

ہے اور جس طرح کے خیالات لڑکیوں میں آرہے ہیں وہ حیران کن ہیں۔

**س:** آپ نے مختلف زبانوں میں جو تحریریں لکھی ہیں کیا وہ سب شائع ہوئی ہیں؟ آپ کی کون سی کتاب یا تحریر مقبول ہوئی ہے؟

**ج:** شروع میں جو میری تحریریں تھیں وہ ترجمہ سے بہت گزری ہیں۔ انگریزی میں بھی اور دوسری زبانوں میں بھی۔ میری کچھ کتابیں اردو میں چھپی ہیں۔

**س:** ہندوستان میں خواتین پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں کون سی زیادہ مفید ہیں؟

**ج:** دیکھیے، اگر میں کہوں تو اردو میں اتنا کام خواتین پر نہیں ہوا ہے۔ ہندی میں اس سے کہیں زیادہ ہوا ہے اور ہر آدمی اپنا نظریہ سامنے رکھ رہا ہے۔ کسی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر ہم فیصلہ نہیں کر سکتے۔

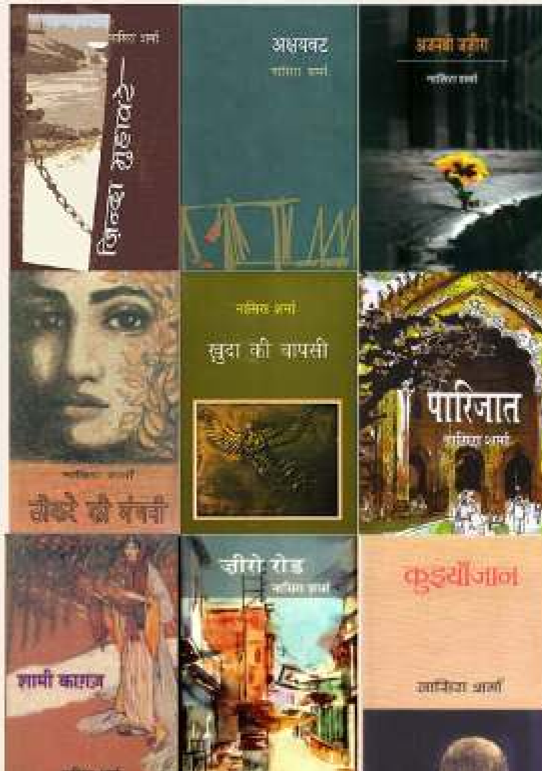


**س:** خواتین کے حقوق کے سلسلے میں جو اسلامی تعلیمات ہیں کیا عدل کے لیے ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

**ج:** بالکل۔ عورتوں کو لے کر اتنے اچھے قانون ہیں کہ اگر اس کو عورت خود پڑھے بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کا سہارا لے۔ اسلامی تعلیمات پر چلنا ضروری ہے۔ جو لوگ ان تعلیمات پر چلنا پسند نہیں کرتے اس کے لیے وہ خود ذمے دار ہیں۔

**س:** بین المذاہب شادیوں کا ہندوستان میں کیا تناسب ہے؟ کیا یہ رجحان بڑھ رہا ہے؟

**ج:** بالکل بڑھ رہا ہے۔

**س:** ہندوستان میں بہت سی تحریکیں اٹھیں۔ سیاسی میدان میں بھی اور تعلیمی اور سماجی میدان میں بھی۔ اس میں ایک تحریک (پیام انسانیت) بھی لکھنؤ سے ابھری۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آج بھی اس کی اہمیت یا ضرورت باقی ہے؟

**ج:** بہت زیادہ۔ اور کیوں نہیں ہوگی۔ آج تو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ صوفیوں کے مزار ہیں آج بھی وہاں ہندو مسلمان جا رہے ہیں۔

**س:** قرآن جن پاکباز خواتین کا تصور پیش کرتا ہے اور ان کی جن صفات اور خصوصیات کا ذکر کرتا ہے کیا اس سے کوئی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے؟

**ج:** بالکل کیا جا سکتا ہے۔

**س:** ہندوستانی ادب میں (خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو) خواتین کو کس طرح پیش کیا گیا ہے اور اس سے تعمیری رجحانات کو فروغ دینے میں کیسے مدد مل سکتی ہے؟

**ج:** جو پرانا لٹریچر تھا جو بچی کہانیاں تھیں وہ یقین کے قابل تھیں۔ آپ کے اندر درد ابھارتی تھیں ایسی کہانیاں تھیں۔ اور انسان کے اندر بدلاؤ کی تمنا پیدا ہوتی تھی۔ آج عورتیں بہت آگے چلی گئی ہیں۔ وہ دبنے والی نہیں ہیں۔

**س:** کیا ہندوستانی سماج میں تضاد پایا جاتا ہے؟ اور کیا یہ تضاد ہر سطح پر موجود ہے؟ اگر ایسا ہے تو ان تضاد کو آپ کس نظر سے دیکھتی ہیں؟ یعنی ایک انسان لکھتا کچھ ہے اور کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔

**ج:** ہاں اس کی مجھے بہت تکلیف ہے۔ اسی لیے میں بہت لوگوں سے آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہوں۔ کیونکہ ایک آدمی سامنے جس طرح گفتگو کرتا ہے اس کے اٹھتے ہی دوسری طرح سے گفتگو کرتا ہے۔ اس سے میرا دل بہت رنجیدہ ہوتا ہے۔ دو چہرے والے لوگ اب بہت ہو گئے ہیں۔ کوئی ایک بات پر ٹکتا ہی نہیں ہے۔ ہاں اس کے اوپر میری ایک کہانی ہے ''دوسرا تاج محل''۔ کتنے لوگ زبانی لنترانی کرتے ہیں ان کو احساس نہیں ہوتا کہ اس میں سچ بھی ہونا چاہیے۔

**س:** ادب خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو سماج کی تعمیر میں اہم رول

ادا کرتا ہے۔ کیا ہندوستان کی مختلف زبانوں میں موجودہ ادب اور ادبی لٹریچر تعمیری رجحانات اور تعمیری جذبات کو رجحان دے پا رہا ہے؟ شعراء ادبا اس سلسلے میں کیا کچھ کر سکتے ہیں؟

**ج**: بہت کچھ کر سکتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں اور کرتے بھی تھے۔ لیکن ایک بات جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ پچھلے تیس سالوں میں جو ہمارے پڑھنے والے ہیں وہ فدا تو بہت ہوتے ہیں ہماری تصنیفات پر۔ بہت تعریف کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ذکر بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ ہمارے خیالات کو ایک تحریک کی شکل نہیں دے پاتے۔ کیونکہ انگلینڈ میں چائلڈ لیبر بند ہوا۔ ہمارے یہاں کوئی ایک ایسا ناول بتا دیجیے جس نے وقت کو بدلا ہو۔ کیونکہ لوگ جن کو آگاہ ہونا چاہیے وہ آواز بلند ہی نہیں کرتے تو رائٹر کیا کر پائے گا۔ لائبریری میں یہ سجا رہے گا۔

**س**: کیا آپ نے تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے؟ یا لکھا ہے؟ آپ کی تنقیدی تحریریں کن چیزوں کے سلسلے میں ہیں؟

**ج**: ہاں تنقید میں نے سماج پر بھی کی ہے۔ ایک سماجی نقاد کی ہی طرح اور ادب میں بھی میں نے کی ہے اور دوسرے انداز سے کی۔ میرا انداز لوگوں کو بہت پسند آیا۔

**س**: کامیاب زندگی کسے کہتے ہیں؟ اور اصل کامیابی کیا ہے؟

**ج**: دیکھیے جو زندگی میں آپ چاہتے ہیں اگر وہ مل جائے تو کامیاب زندگی ہے۔ اصل کامیابی بھی وہی ہے۔ ہاں ایک جگہ میں نے جملہ پڑھا تھا ''وہ قابل تو تھا مگر کامیاب نہیں تھا''۔ یہ دو چیزیں بالکل الگ ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ اپنی زندگی خود سے جیتے ہیں اور ایک آپ دنیا کی نظروں میں کامیاب نہیں ہیں۔ پھر وہی بات ہوئی کہ ''پڑھی فارسی بیچے تیل'' طنزیہ کہی گئی ہے کہ آپ اتنے قابل ہیں اوقات کیا ہے۔

**س**: قدامت پسندی اور جدت پسندی کو آپ کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

**ج**: مجھے لگتا ہے کہ نئی تہذیب تو مجھے بہت زیادہ متاثر نہیں کرتی اور نہ قدیم تہذیب مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ بہت اچھی تھی۔ اس میں ضرورت سے زیادہ آزادی ہے۔ مجھے لگتا ہے دونوں تہذیبوں کا مکسچر ایک بیلنس انداز لے کر چلنا چاہیے ہم کو۔

**س**: اردو کی ترقی کے لیے دہلی میں کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کاموں کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہیں؟

**ج**: کام تو ہو رہے ہیں۔ لیکن مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس لیے میرے پاس کوئی تجربہ نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ اردو میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ میری بھی بہت سی تصانیف کے ترجمے ہوئے ہیں۔ لوگوں نے پسند بھی کیے ہیں۔ میرا ایک ناول ہے جو بہت پسند کیا گیا وہ پینے کے پانی کی کمی پر ہے۔ لیکن وہ اردو میں نہیں آیا۔ جیسے ''کوئیاں جان'' تھی۔ انھوں نے اسے اردو میں نہیں کیا۔ ''شالملی'' اردو میں آئی تو اسے دو انعام ملے۔ ایک بہار اکیڈمی ایوارڈ اور ایک دہلی کا۔

**س**: اب تک آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

**ج**: میں سب کے نام گنوانے لگوں تو بہت سی چھوٹ بھی جائیں گی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ کے نام میری یادوں کے دریچوں میں اب بھی موجود ہیں۔ ان میں میرے بہت سے ناول اور کہانیوں وغیرہ کے مجموعے ہیں۔ ''سات ندیاں ایک سمندر''، 'شالملی'، 'ٹھیکرے کی منگنی'، 'زندہ محاورے'، 'اکشے وٹ'، 'کوئیاں جان'، 'زیرو روڈ'، 'اجنبی جزیرے' اور 'کاغذ کی ناؤ'، 'پاری جات' اسی کے ساتھ کہانیوں کے مجموعے 'شامی کاغذ'، پتھر گلی، سنگسار، ابن مریم، شبنہ کے چالیس چور، خدا کی واپسی، انسانی نسل، دوسرا تاج محل، بت خانہ وغیرہ۔ ہاں زندگی کے سفر میں بہت ساری اور بھی چیزیں کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ اس میں مضمون ڈرامہ، انٹرویو بھی کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ قدم آگے بڑھتے گئے۔ ہر ایک نئی صبح میری زندگی میں ایک نیا پیغام لے کر آتی اور میں نکل پڑتی ایک نئی راہ۔ ان میں شامل تھے وہ لمحے جب میں نے انٹرنیشنل سیمنار میں شرکت کی تھی۔ ایک جرنلسٹ کے طور پر۔ اسی کے ساتھ عراقی ٹی وی فارسی زبان اور انگریزی زبان میں بھی کئی انٹرویو دیے۔ فارسی دری و دنیا کی مختلف زبانوں کا انٹرنیشنل مشاعرے میں اسپیچ، جو کابل میں ہوا 1987 میں ریڈیو پروگرام اور ٹی وی فلم بھی میری کہانیوں پر بن چکی ہیں جن میں 'سیمل کا درخت' ہے۔ جس کی کہانی اور ڈائیلاگ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ جس کا ڈائریکشن مظفر علی نے کیا۔ اس کے بعد 'کالی موہنی'، 'آیا بسنت سکھی'، 'ماں' ان کی بھی کہانیاں اور اسکرین پلے لکھا۔ ٹی وی سیریل 'شالملی'، 'فریب'، 'دو بہنیں'، 'بدلا زمانہ' وغیرہ۔ ریڈیو سیریل 'میں لوٹ آیا ہوں'۔ کارواں بڑھتا رہا مگر پھر بھی لگتا تھا منزلیں اور بھی ہیں۔ جب انعامات اور بہت سے ایوارڈ ملے تو خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

□□□

**Zaibun Nisa**

A-1, 4th Floor, M.M. Apartment

Okhla Vihar,

New Delhi-110025

ڈاکٹر عرش کاشمیری

# خدیجہ مستور کا سیاسی وسماجی شعور

## 'محاذ سے دور' کے حوالے سے

خدیجہ مستور ایک فعال مصنفہ کا نام ہے۔ جنھوں نے بے شمار افسانے اس نوعیت کے لکھے جن کی بنا پر انھیں تانیثی ادب کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں ان کے اہم افسانہ " محاذ سے دور" کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے تخلیق کردہ اہم نسوانی کرداروں کی تانیثی قرات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس افسانے میں 'مائی' خدیجہ مستور کا مرکزی کردار ہے۔ جو تانیثی ادب میں ایک لافانی کردار کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ اس کردار میں وہ سارے پہلو موجود ہیں جو تانیثیت کے بنیادی موضوعات ہیں۔

تانیثیت مابعد جدیدیت کی ایک اہم تھیوری ہے۔ جس کا مقصد ادب میں نسوانی کردار کو اُجاگر کرنا ہے۔ یہ تھیوری ادب میں فیمنزم کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ مغربی دنیا میں اس تھیوری کو عورتوں کا نظریہ، تحریک نسواں یا عورتوں کی حمایت کرنے کا نظریہ جیسے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ معنوی اعتبار سے تانیثیت سے مراد ایک ایسا رجحان، فکر یا نظریہ جو سوسائٹی میں عورت کے مقام کا تعین کرے، عورت کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرے اور اس کے علاوہ مرد کی بالا دستی، مرکزیت، عورت کے ثانوی درجہ وغیرہ کو حدف تنقید بنائے۔ اس نظریہ کے دائرہ عمل میں دورِ حاضرہ میں عورت پر ہو رہے ظلم وجبر، جنسی استحصال، غیر مساوی حقوق جیسے مسائل پر بحث ومباحثہ کرنا اور اس کے خلاف تحریر وتقریر کرنا شامل ہے۔

مابعد جدیدیت کے بنیاد گزاروں اور نقادوں کا ماننا یہ بھی ہے کہ تانیثیت سے مراد خواتین قلم کاروں کو ادب میں حاشہ پر رکھنے کے بجائے مرد کے برابر مرکز میں جگہ دینا اور ان کی تحریرات کو ادب میں شامل کرنا بھی اس تحریک کے دائرہ میں آتا ہے۔ اس طرح بات صاف ہو جاتی ہے کہ عورتوں کے سماجی، سیاسی، معاشی اور خارجی وداخلی مسائل کو ادب میں اجاگر کرنے کی عملی کوشش کو بھی اس تھیوری کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ تانیثی ادبی تحریر کی تعریف پروفیسر قدوس جاوید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> " تانیثی ادبی تحریر وہ ہے جس میں سماجی وثقافتی، آئینی و معاشی وغیرہ تمام انسانی سطحوں پر عورت کو حاشیہ پر رکھنے کی بجائے مرد کے برابر مرکز میں رکھا جائے۔ چنانچہ ایسی ادبی تحریر (شعر، نظم، افسانہ، ناول یا مقالہ) جس میں عورت کو مساوی حقوق، انصاف اور مقام ومرتبہ دینے کی وکالت کی گئی ہو اس سے غرض نہیں کہ لکھنے والا عورت ہے یا مرد طبقہ نسواں میں شعور ذات کی بیداری، عرفان نفس کا حصول اور زندگی کے تمام شعبوں میں عورت ( طبقہ نسواں ) کو مرد کے مساوی

حقوق اور مواقع فراہم کرنا ہی تانیثیت کی تحریک ،فکر یا تھیوری کے بنیادی خصائص ہیں۔''

(متن معنی اور تھیوری: پروفیسر قدوس جاوید، ص 152-153)

**افسانہ ''محاذ سے دور'' خدیجہ مستور کی ایک اہم تخلیق ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے عورت کے سماجی مسائل اس طرح بیان کیے ہیں کہ قاری کی ساری توجہ عورت ذات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ افسانے میں کئی نسوانی کردار موجود ہیں جو اپنی منفرد نفسیات کے ساتھ کہانی میں اُبھرتے ہیں۔ ان سب کرداروں کے نسوانی مسائل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایسے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جہاں عورت کا مقام ثانوی ہے۔ افسانے کا کردار 'مائی' پہلی جنگ عظیم میں اپنے شوہر سے ہاتھ دھو بیٹھی اور دوسری جنگ عظیم میں اپنے جوان بیٹے کی شہادت دیتی ہے**

خدیجہ مستور ان افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے قلم کو تانیثی ادب کے لیے وقف کیا ہے۔ ان کے بے شمار افسانے معاشرتی حقائق اور سماجی موضوعات پر قلم بند ہیں۔ انھوں نے عورت اور سماج کے مابین مسائل کو بنیاد بنا کر بے شمار کہانیاں لکھیں۔ ان کے خاص موضوعات بھوک، افلاس، نا انصافی، جنسی استحصال اور ظلم و جبر ہیں۔ رشید جہاں اور عصمت چغتائی سے متاثر ہونے کی صورت میں ان کی کہانیوں میں عورت ذات کا منفرد لہجہ ملتا ہے۔ جنسیات اور تانیثیت پر انھوں نے جتنا بھی لکھا بے باک انداز میں لکھا ہے۔ کھیل، ٹھنڈا میٹھا پانی، بوچھار، برہنہ لاشیں، دادا، محاذ سے دور اور چپکے چپکے ان کی اس ہنر مندی کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار فعال اور متحرک ہیں۔ کرداروں کے افعال پر ان کی گرفت مضبوط رہتی ہے جس سے وہ کرداروں کو بڑی چابکدستی کے ساتھ استعمال میں لا کر کہانی کو موثر بناتی ہیں۔ فکشن میں پلاٹ سے زیادہ کرداروں کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اردو ادب میں بہت سی کہانیاں ہیں جو ان کے کرداروں کے ذریعے مشہور ہیں۔ کردار جتنا فعال اور متحرک ہوگا کہانی کا کلائمکس اتنا ہی پُر تاثیر ہوگا۔ اس ضمن میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''مختصر افسانے میں پلاٹ سے زیادہ کردار کی اہمیت ہے۔۔۔۔ کردار جو حقیقی اور زندہ ہوتے ہیں وہ پڑھنے والے کے حافظے میں داخل ہو کر وہیں ٹھہر جاتے ہیں۔''

(تنقید اور عملی تنقید: احتشام حسین، ص 54)

افسانہ ''محاذ سے دور'' خدیجہ مستور کی ایک اہم تخلیق ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے عورت کے سماجی مسائل اس طرح بیان کیے ہیں کہ قاری کی ساری توجہ عورت ذات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ افسانے میں کئی نسوائی کردار موجود ہیں جو اپنی منفرد نفسیات کے ساتھ کہانی میں اُبھرتے ہیں۔ ان سب کرداروں کے نسوانی مسائل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایسے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جہاں عورت کا مقام ثانوی ہے۔ افسانے کا کردار 'مائی' پہلی جنگ عظیم میں اپنے شوہر سے ہاتھ دھو بیٹھی اور دوسری جنگ عظیم میں اپنے جوان بیٹے کی شہادت دیتی ہے۔ غرض جنگ ہاری جائے یا جیتی جائے ایک عورت کے لیے دونوں صورتوں میں نقصان ہی ہوتا ہے۔ قدرت نے ایک عورت میں جو محبت اور شفقت داخل کی ہے یہی دراصل اس کی سب سے بڑی فطری کمزوری ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہر دفعہ داخلی طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں مائی کا شوہر شہید ہوتا ہے۔ اس کا گھر لٹ جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ اس کی منظر نگاری کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''پہلی جنگ عظیم۔ جب اس کا شوہر اس کی جوان آغوش میں صرف ایک ننھی سی جان سونپ کر لڑائی پر چلا گیا تھا۔ وہ اس لئے گیا تھا کہ غریب کسان کی محنت کا پھل زمیندار کھاتا تھا۔ وہ اسے روک نہ سکی تھی اس کا حسن، اسکی جوانی اور معصوم بچے کی کلکاریاں اس کے پاؤں کی بیڑیاں نہ بن سکی تھی۔ وہ ننگا بھوکا رہتے تنگ آ چکا تھا۔۔۔۔۔ لیکن وہ نہ آیا اس کی موت کی خبر آ گئی اور اس کے انتظار نے بھی دم توڑ دیا۔''

(خواتین کے نمائندہ افسانے: محمد قاسم صدیقی 'مرتب' ص 223-224)

مائی نے اپنی جوانی کے سارے حسین پل تنہا گزارے تھے۔ خدیجہ مستور نے مائی کی خستہ حالی کے علاوہ اس معاشرے کی تصویر کشی بھی کی ہے جہاں عورت ذات کو بیوہ ہونے پر در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں یعنی سماج میں بُرے لوگوں کا سامنہ، بُری نظروں کا مقابلہ۔ قاری افسانے میں ایسے سماج کو دیکھتا ہے جسے تانیثی تھیوری میں مرد اساس معاشرہ کے نام

سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں عورت کو ثانوی حیثیت حاصل ہے اور مرد عورت کو اپنا غلام یا خریدی ہوئی شئے سمجھتا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر قدوس جاوید رقمطراز ہیں:

''مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی سطحوں پر مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کے درجے مختلف ہیں وہ کہیں داسی ہے، کہیں کنیز، کہیں کٹھ پتلی، تفریح کا ذریعہ، کہیں ملکیت گویا عورت ایک شے (commodity) یا طبقے کی طرح ٹائپ ہے اور تابعداری جس کی تقدیر۔''

(متن معنی اور تعبیری: پروفیسر قدوس جاوید، ص 165)

افسانے کے سب سے اہم کردار 'مائی' کے سر پر بھی ایسے بادل منڈلا رہے تھے۔ لیکن مائی نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنی گرفت میں رکھنے کی بہت کوشش کی ہے۔ 'مائی' کا کردار یہاں خدیجہ مستور نے کٹھ پتلی کی طرح نہیں دکھایا بلکہ اسے ایک وفادار اور شرمسار عورت کے روپ میں دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے کردار میں ہمت اور شجاعت شامل کر کے اسے لافانی کر دیا۔ جب مائی بیوہ ہو جاتی ہے۔ ہمت تو نہیں ہارتی بلکہ ڈٹ کر اپنے کچے بوسیدہ مکان میں ایام مفلسی گزارتی ہے۔ کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں کرتی۔ اس نے اپنا ضمیر نہیں بیچا۔ ایک عورت ہونے کے باوجود بھی نفسانی خواہشات اور جنسی ضرورتوں سے خود کو محروم رکھا تا کہ سماج میں اُس کا وقار بلند رہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''وہ رات دن اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہتی۔ لیکن وہ نہ آیا اس کی موت کی خبر آ گئی اور اس کے انتظار نے بھی دم توڑ دیا۔ کچھ دن تک وہ ہر طرف غافل ہو کر روتی بلکتی رہی اور پھر اپنی محبت کے اچھے دنوں کی یادگار کو پروان چڑھانے میں خود کو گم کر دیا۔ ان دنوں یہ بھی ہوا کہ جب لوگوں نے میدان صاف دیکھا تو ایک ذرا دوڑ لگانے کی کوشش کی مگر اس نے بھی ایسی ایسی پٹخنیاں دیں کہ اچھے اچھے ہمت کھو بیٹھے۔ اس کی دنیا اس کا لال تھا۔ وہ محنت اور مزدوری کر کے اپنے بچے کو پالنے لگی اور جب سرکار کی طرف سے زندگی کی قیمت ہر ماہ چند سکوں میں چکائی جانے والی تھی تو لوگوں نے دشمنی کر کے اس کا بھی خاتمہ کر دیا تا کہ وہ مصیبتوں سے تنگ آ کر خود کو بیچ دے۔''

(خواتین کے نمائندہ افسانے: محمد قاسم صدیقی 'مرتب۔ ص 224)

درجہ بالا اقتباس میں خدیجہ مستور سماج اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں جہاں ایک لاچار عورت کو معاشرے کے لوگ ہی غلط راہ کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح خدیجہ مستور نے بین المتن میں کئی طرح کی باتیں پوشیدہ کر کے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ افسانے میں اس فقرے 'مصیبتوں سے تنگ آ کر خود کو بیچ دے' میں ایک پوری کہانی پوشیدہ کر دی ہے۔ اس طرح افسانہ نگار مرد اساس معاشرے پر کئی طرح کے سوالات کھڑا کرتی ہیں۔ سماج میں رہنے والے مرد اس مظلوم عورت کی مدد بھی کر سکتے تھے۔ اس کا سہارا بھی بن سکتے تھے لیکن اس طرح کی سوچ سے تمام معاشرے خالی نظر آتا ہے۔

مائی سماج کی بُرائیوں کا مقابلہ ہمت سے کرتی ہے وہ تب تک ہمت نہیں ہارتی جب تک کہ اس کا بیٹا جوان ہو جاتا ہے۔ محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے بیٹے کو پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ اب وہ شہر جا کر کوئی اچھا سا کام دھندا کر سکے۔ یہاں مصنفہ کے ذریعے ایسی باہمت عورت کی تصویر کشی کی جا رہی ہے جو شوہر کی موت کے بعد مرد بن جاتی ہے اور خود ہر مشکل کا حل ڈھونڈ نکالنے کی ممکن کوشش کرتی ہے۔ اس کا جوان بیٹا شہر جا کر نوکری نہ ملنے سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اس کا اثر بوڑھی ماں پر پڑتا ہے۔ وہ اس رات بہت روتی ہے جب اس کے بیٹے کا خط آتا ہے۔ جس میں وہ اصرار کرتا ہے کہ وہ ساتھ سمندر پار جا کر جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیاری کرتا ہے۔ مائی کو بیٹے کی اس طرح مایوسی کی توقع نہ تھی۔ اس نے ایک باپ کی طرح اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اس قابل بنایا تھا کہ وہ محنت کر کے ماں اور اپنا پیٹ پال سکتا تھا لیکن وہ بھی اپنے باپ کی طرح حالات سے لڑتے لڑتے تھک کر ہار چکا تھا۔ خدیجہ مستور نے ماں کی نفسیاتی کیفیت کو یہاں جس انداز میں ظاہر کیا وہ ایک حساس قاری کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ماں پر گزری ہوئی اس صورت حال کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''وہ روتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس کا بیٹا جاہل کیسے ہے۔ اس نے اُسے مڈل تک پڑھایا ہے یہاں کتنے مڈل پاس ملازم ہیں۔ اسکول ماسٹر تک مڈل پاس ہیں اور پھر اس نے اپنے بیٹے کو خط لکھوایا کہ وہ آ جائے وہ پھر اسی طرح محنت مزدوری کر کے سب کا پیٹ بھرے گی۔ اب اس میں کام کی طاقت آ گئی ہے۔ اور اب وہ بیکار بیٹھے بیٹھے بھی اُکتا گئی ہے۔ وہ گھر ضرور آ جائے دُلہن اداس رہتی ہے، اور اس کی گود ہری ہونے والی ہے، مگر وہ نہیں آیا۔''

(ایضاً۔ ص 225۔226)

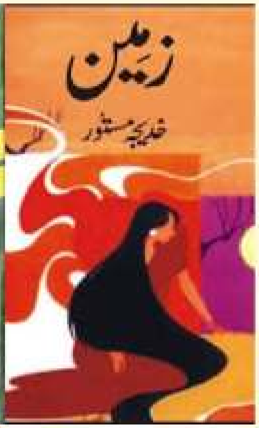


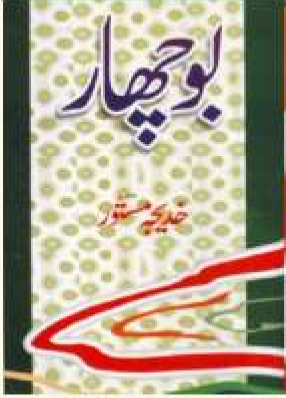


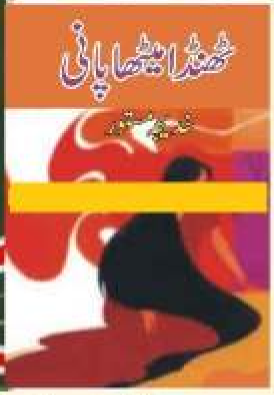


خدیجہ مستور نے اس افسانے میں عورت کے بیشتر مسائل اُبھارے ہیں۔ دنیا کی ہر تکلیف مائی کے کردار میں پوشیدہ ہے۔ مائی کا کردار اس طرح پوری عورت ذات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس نے شوہر کی موت کے بعد بہت محنت کی۔ سماج سے کسی قسم کی کوئی مدد نہ ملی۔ اس کے بعد محنت مزدوری کر کے اپنے بیٹے کو جوان کیا۔ بیٹا بھی جب باپ کی طرح جنگ میں شہید ہو گیا تب تک مائی کے کالے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ ایک عورت سے بوڑھی بن چکی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت ختم ہو چکی تھی۔ اس کی کمر ٹیڑھی ہو چکی تھی اور اسی حالت میں اس کی بہو نے اسے دھوکا دیا اور موقع پا کر مائی کے گھر سے فرار ہو گئی۔ ایک بار پھر مائی سماج کے آگے کٹھ پتلی بن کر رہ گئی، اس نے پہلے اپنا خاوند اور پھر اپنا جوان بیٹا کھو دیا تھا، لیکن بدلے میں مائی کو در در کی ٹھوکریں کھانی پڑی۔ ایک مظلوم بے سہارا عورت کی منظر نگاری خدیجہ مستور اس طرح کرتی ہیں:

”رو دھو چکنے کے بعد اب صرف ایک سوال بھوت کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اب اپنا پیٹ کیسے بھرے گی۔ اب اس سے محنت مزدوری نہ ہو سکتی تھی۔ اس کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ محلے والوں نے دو چار دن ترس کھا کر اسے دو وقت کھانا کھلا دیا تھا مگر کوئی یوں کب تک کھلاتا۔۔۔۔ گھر میں پڑی چپ چاپ رویا کرتی جب کئی کئی وقت خالی پیٹ گزر جاتے تو پھر بلبلا کے گھر سے نکل پڑتی۔ اِدھر اُدھر گھروں میں جا بیٹھتی، کبھی بے مانگے تو کبھی مانگنے کے بعد آدھی ٹکڑا روٹی سے زیادہ ملتی جس سے پیٹ کی آگ تو تھوڑی بہت بُجھ جاتی مگر دل کی آگ زیادہ ہو جاتی جسے آنسوؤں سے بُجھانے کی کوشش کرتی۔“

(ایضاً۔ ص234)

کردار نگاری کے اعتبار سے افسانہ ”محاذ سے دور“ قابلِ تعریف ہے۔ مائی کے علاوہ افسانے میں بہو اور زمیندار کی بیٹی کا کردار بھی اہم ہے۔ مائی کے بعد سب سے فعال کردار بہو کے روپ میں نظر آتا ہے۔ جب اس کا شوہر مر جاتا ہے تو وہ بے ہوش ہو کر گر جاتی ہے۔ چیخ و پکار کرتی ہے۔ آخر وہ بیوہ ہو گئی۔ ایک ہندوستانی وفادار عورت کے سارے گُن قاری اس میں پاتا ہے۔ وہ وفا شعاری کی ایک مثال بن جاتی ہے۔ اس رات شوہر کی موت کی خبر سنتے ہی بہت روتی ہے۔ محلے بھر کی عورتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ سمجھاتی، بہلاتی ہیں مگر بہو پریشان ہو کر اپنے بستے ہوئے گھر کو اُجڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ اس کی دُنیا لٹ چکی تھی۔ اس کا شوہر اس کی گود میں ایک معصوم چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔ اس کی گود میں پلتا معصوم دُنیا کے نشیب و فراز سے بالکل بے گانہ تھا۔ اس طرح خدیجہ مستور نے موت سے ہونے والے منظر کو بڑی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ پیش کیا۔ جب وہ صدمے سے سنبھل جاتی ہے تو ساس کی خدمت میں جُٹ جاتی ہے۔

اس طرح یہاں خدیجہ مستور نے اس عبارت سے سماج پر سوالیہ نشان کھڑا کیا ہے۔ یہ وہ سماج ہے جہاں ایک بیوہ کی دوسری شادی کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ مرد اساس سماج میں ایسی عورتوں کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہوتا ہے۔ یہاں بہو کی کسمپرسی، ذہنی تناؤ اور نفسیاتی الجھنوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بہو نے پہلے پہل ہمت سے کام لیا تھا۔ بہت کوششوں کے بعد وہ ایسا کرنے سے ناکام ہوئی۔ وہ ایک جوان عورت تھی اسے سہارے کے علاوہ اور بھی بہت سی ضروریات تھیں۔ ایسے ماحول میں وہ اکیلی کیسے رہ سکتی تھی جہاں مدد کے لیے کوئی موجود ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بہو کے کردار میں تضاد پایا جاتا ہے۔ بالآخر وہ ہمت کھو دیتی ہے اور غیر رسمی طور پر اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

”ایک دن صبح سب کو معلوم ہوا کہ بہو اپنا سب کچھ چھوڑ کر اور

صرف اپنے بچے کو لے کر راتوں رات منشی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔" (ایضاً، ص236)

"مائی" کا کردار بہو کے کردار سے بھی فعال نظر آتا ہے۔ سارا افسانہ اُس کے ارد گرد گھومتا ہے۔ کہانی میں مائی کی زندگی کے کئی گوشے دکھائے گئے ہیں۔ مائی کی جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کے سارے دورناک حادثات و واقعات کو کہانی کار نے افسانے میں اُجاگر کیا ہے۔ کبھی خاوند کے مرنے کا غم، کبھی جوان بیٹے کے مرنے کا الم تو کبھی بہو کی بدمزاجی کا شکار۔ زندگی کے نشیب و فراز کا زیادہ اثر مائی پر پڑتا ہے۔ ان حادثات میں اُس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ خدیجہ مستور نے مائی کے کردار کے دُکھ درد، پریشانی اور مایوسی کی عکاسی فنکاری سے کی ہے۔ مائی نہ بیوی رہی، نہ ماں اور ساس بن کر بھی ساس نہ بن سکی۔ وہ دُکھ اور پریشانیوں کے تھپیڑے کھاتی رہی۔ قاری کا ذہن افسانہ پڑھتے ہی مائی کی طرف فوراً مائل ہو جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو مائی کا کردار دوسرے اہم افسانوں کے نسوانی کرداروں سے کم تر نہیں ہے۔ آخری کوشش (حیات اللہ انصاری) کی ماں اور کفن (پریم چند) کی بدھیا بھی اسی نوعیت کے کردار ہیں۔ عورت ذات پر ظلم و جبر کے علاوہ جنسی بھی سماجی تکالیف ہیں وہ ساری مائی کے حصے میں آتی ہیں۔ اس طرح یہ افسانہ اہمیت کا حامل ہے۔ افسانے میں عورت ذات کے بنیادی مسائل پر کھل کر لکھا گیا ہے۔ خدیجہ مستور افسانہ لکھنے کے فن میں نمایاں اور کامیاب نظر آتی ہیں۔

□□□

**Dr. Aresh Kahsmiri**
Lecturer Urdu
University of Kashmir (South Campus)
Dora Shahabad
Anantnag Kashmir-192211 (J&K)

**Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"**

## سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .................... بتاریخ ....................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....................

پتہ : ....................

....................

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

# شاعرات کے منتخب اشعار

پیچ و تاب زلف پیچاں خم بہ خم
کون کہتا ہے جنوں ناکام ہے

شیشۂ مینا میں پنہاں برق ہے
حسن پر فن آج زیرِ دام ہے

رابعہ پنہاں

ہیں خندہ زن تری حالت پہ شمع و آئینہ
کسی کے بزم میں اپنا مقام پیدا کر

کسی کی بزم میں مڑ مڑ کے نقش پا نہ دیکھ
مہہ و ستارہ کی شان خرام پیدا کر

زیب عثمانیہ

الزام محبت کا ناحق مجھے دیتے ہیں
پوچھو تو پڑی کس کی دز دیدہ نظر پہلے

میں نے پوچھا کہ کبھی ربط بھی تھا ہم سے تجھے
کس رکھائی سے کہا اس نے ’مجھے یاد نہیں‘

صالحہ بیگم مخفی

تمنا ہے فزوں ہوں شورشیں جذب محبت کی
دل مضطر کی بڑھتی اور بھی وحشت تو اچھا تھا

حیا ٹھکانہ بھی ہے کچھ ایسی دردمندی کا
کہ لب تک آئے نہ اک حرف اور بیاں ہو جائے

حیا لکھنوی

کیا قیامت تھی پردہ داریٔ غم
مسکراتے ہی آگئے آنسو

وہ حسرت بہار نہ طوفان زندگی
آتا ہے پھر رلانے کو ابرِ بہار کیوں

صفیہ شمیم

میں نے گھر تک جلا کے دیکھ لیا
ان کے گھر تک ہی روشنی نہ گئی

مرے نصیب میں لکھی تھی کیوں شب فرقت
رقیب نے مرے، اللہ شرمسار کیا

رابعہ سلطانہ ناشاد

جلے نہ دل تو بھلا شعر میں کہاں تاثیر
جو لحن میں لچک ہو تو کیا گداز آئے

بغیر درد کے نغموں میں کیا مزہ مظہر
بغیر سوز کے کیا خاک لطف ساز آئے

سعیدہ عروج مظہر

پکارتے ہیں کنارے کھڑے ہوئے ناداں
مجھے تو ڈوبنا ہے ہاتھ کیوں بڑھاؤں میں

مجھے اک شوق ایسا دے مجھے اک درد ایسا دے
جو تیرا مبتلا کر دے جو رازِ عشق سمجھا دے

بیگم رضیہ حلیم جنگ

ڈاکٹر فرزانہ خلیل

# اردو شاعری میں استاد کی اہمیت

سیکھنے اور سکھانے کا عمل بہت پرانا ہے۔ انسان جب تاریک دور میں زندگی گزار رہا تھا تو وہ فطرت سے بہت کچھ سیکھتا تھا اور آج ترقی یافتہ دور میں بھی فطرت سے ہم کچھ سیکھتے ہیں۔ یہاں فطرت ایک استاد کی مانند ہے۔ اسی طرح ہماری معاشرتی زندگی میں بھی سیکھنے اور سکھانے کے بہت سے اسکول قائم ہوئے۔ اس کی باقاعدہ شروعات یونان کی سرزمین پر ہوئی جہاں پہلی بار افلاطون نے اپنے چند شاگردوں کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر تدریس کی ابتدا کی اور اسے اسکول نام دیا گیا۔ دراصل انسانی تاریخ میں آمنے سامنے بیٹھ کر علم حاصل کرنے کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے اور اس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی آغوش میں لے لیا اور دیکھتے دیکھتے اساتذہ کی ایک جماعت تیار ہوگئی۔ اساتذہ ٹھیک اس عمارت کی بنیاد کی طرح ہوتے ہیں جو پوری عمارت کا بوجھ اٹھاتے ہیں عمارت کی بنیاد جتنی مضبوط ہوگی عمارت اتنی ہی مستحکم اور پائیدار ہوگی۔ لہٰذا تمام علوم میں اساتذہ کی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔

اردو کے حوالے سے اگر دیکھیں تو شعری ادب کی روایت میں استاد کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں استاد ایک والد کا درجہ رکھتا ہے اور شاگرد کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھتا ہے۔ اگر آپ اردو کی شعری روایت کا غائبانہ نظروں سے مطالعہ کریں تو شاید ہی دو چار شاعر ایسے ملیں گے جنھوں نے کسی کی شاگردی نہ اختیار کی ہو جسے ہم زانوئے تلمذ تہہ کرنا بھی کہتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ بادشاہوں، نوابوں اور سلطانوں نے بھی اپنی غزلوں کی اصلاح کے لیے اساتذہ مقرر کیے جس کی وجہ سے ادبی معرکہ آرائی بھی ہوئی۔ استاد کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے عبدالغفور لکھتے ہیں:

> ''استاد تعمیر حیات کرتا ہے، اینٹ پتھر کے گھروندے، لکڑی لوہے کی تعمیر و تربیت ہے۔ اینٹ و پتھر کی عمارت اگر بیٹھ گئی تو ایک دو گھر لے کر بیٹھ جائے گی۔ اگر کسی نکمے اور سست کاریگر نے ہوائی جہاز میں ڈھیلا پرزہ لگا دیا تو ممکن ہے کہ ایک بہادر ہوا باز کی جان اکارت چلی جائے۔ لیکن اگر دلبرداشتہ اور افسردہ استاد نے منزل حیات میں کوئی اینٹ ٹیڑھی لگادی تو ڈر ہے کہ سماج کا پورا محل کھڑا کھڑاتا ہوا نیچے آ جائے گا۔''

(استاد کی اہمیت مشمولہ رسالہ جامعہ 1942)

فنون لطیفہ کی تاریخ بھی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ استاد اور شاگرد کے رشتوں نے نہ جانے کتنے منظر ناموں میں رنگ بھرا اور وہ دنیا کے شاہکار بن گئے۔ یہی استاد شعر و سخن کی دنیا میں جب شاگردوں کی اصلاح کرتا ہے تو فن شاعری کو عروج حاصل ہوتا ہے اور نت نئے خیالات اور لفظیات کے استعمال سے ہمارے املاک دانش میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعری میں استاد

کی اہمیت وعظمت کو ہر دور میں سراہا گیا ہے۔ کبیر اپنے دوہوں میں استاد کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ استاد کا رتبہ خدا کے برابر ہے۔

گرو گووند دو کھڑے کا کے لاگو پائے
بلی ہاری گرو آپنے گووند دیو بتائے

ایک اور دوہے میں کبیر نے استاد کی اہمیت کی نشان دہی کی ہے:

گرو بن گیان نہ اپجے گرو بن ملے نہ موش
گرو بن لکھے نے ستیہ کو گرو بن مٹے نہ موش

کبیر داس کا کہنا ہے کہ استاد ہی ایک ایسا ذریعہ علم ہے جس کے ذریعہ خدا تک پہنچا جاسکتا ہے۔

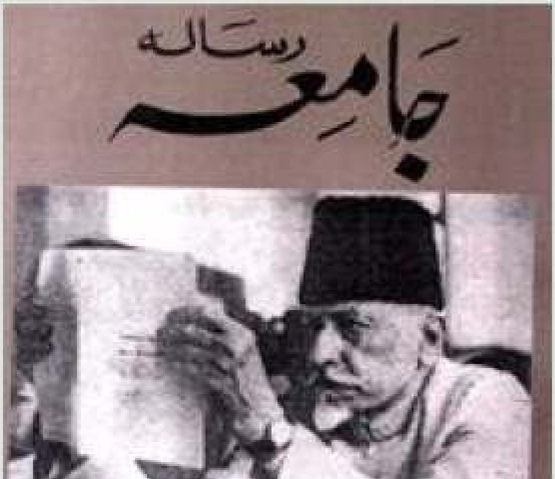


اردو کی شعری روایت میں استاد کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ غالب جیسا شاعر بھی اس روایت سے بغاوت نہ کرسکا اور اپنے شعری قد کو بڑھانے کے لیے بیدل کو اپنا استاد مان لیا۔ حالانکہ تحقیقی اعتبار سے غالب کے کسی استاد کا پتہ نہیں چلتا۔ بہادر شاہ ظفر نے ذوق اور غالب کو اپنا استاد سخن بتایا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے استاد کی عزت واحترام اور عظمت کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ شعر دیکھیں:

ماں باپ اور استاد ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک ان کی حق میں تمہارے نعمت
کڑوی نصیحت میں ان کی بھرا ہے امرت
چاہو اگر آپ بڑائی تو کہنا بڑوں کا مانو

پنڈت برج موہن نرائن چکبست کہتے ہیں:

ادب تعلیم کا جوہر ہے، زیور ہے جوانی کا
وہی شاگرد ہیں جو خدمت استاد کرتے ہیں

حفیظ جالندھری ایک رومانی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں سادگی اور محبت کی چاشنی ہے۔ حفیظ نے 'شاہنامہٗ اسلام' لکھ کر کافی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے رومانی شاعری کے ساتھ ساتھ استاد کی عظمت کو ان لفظوں میں سراہا ہے:

اب مجھے مانے نہ مانے اے حفیظ
مانتے ہیں سب مرے استاد کو

لالہ مادھو رام جو ہر مرزا غالب کے ہم عصر تھے انھوں نے سیاسی شاعری سے لے کر مزاحیہ شاعری تک کی ہے۔ لالہ مادھو رام کے یہاں بھی استاد کی اہمیت وعظمت کا پرتو دکھائی دیتا ہے:

وہی شاگرد پھر ہو جاتے ہیں استاد جوہر
جو اپنے جان و دل سے خدمت استاد کرتے ہیں

اسی طرح شاعر اگیات کے یہاں بھی ہمیں استاد کی عظمت و اہمیت پر اشعار ملتے ہیں جن میں اگیات نے بہت ہی سادگی اور خوش اسلوبی سے استاد کی عظمت کو بیان کیا ہے:

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں
دیکھا نہ کوہکن کوئی فرہاد کے بغیر
آتا نہیں ہے فن کوئی استاد کے بغیر
رہبر بھی یہ، ہمدم بھی یہ، غم خوار ہمارے
استاد یہ قوموں کے ہیں معمار ہمارے

گویا اردو شاعری کا کوئی بھی دور لے لیں یا مکتبہ فکر ہر جگہ استاد کو نہایت عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا گیا ہے اور ان کی خدمت کرنا عین سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اظہار کھل کر شاعروں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ راسخ عظیم آبادی اپنے استاد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ
استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا

شاعر، ادیب، صحافی، عالم دین اور تحریک آزادی کے علمبردار مولانا حسرت موہانی سے کون واقف نہیں۔ سیاسی عمل میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ مولانا حسرت موہانی نے رومانی غزلیں بھی خوب کہیں:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

لیکن اپنی تمام تر مقبولیت کا سہرا حسرت موہانی اپنے استاد کے سر باندھتے ہیں:

غالب، مصحفی، میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

ہمارے مشہور غزل گو شعرا کے یہاں بھی اساتذہ کرام کی اہمیت وعظمت دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً غالب، ذوق، حسرت، حالی اور دیگر شعرانے خدائے سخن میر تقی میر کو اپنا استاد مانا ہے اور اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہیں تو معتقد میر نہیں
اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں
ریختی کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یارو نے بہت زور غزل میں مارا
شعر میرے بھی ہیں پر درد لیکن حسرت
میر کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں
حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں
غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا

اس طرح اگر دیکھا جائے تو ان باکمال غزل گو اور نظم گو شعرا نے میر کو گفتگو سخن وری میں استاد مانا ہے اور خود کو میر کا مقلد و معتقد کہا ہے۔

استاد کی اہمیت وعظمت کو کسی بھی دور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا عہد حاضر میں بھی ہمارے نوجوان شاعر اپنی شاعری میں اساتذہ کی اہمیت کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قیصر حیات نے اپنے استاد کو یوں یاد کیا ہے:

سنگ بے قیمت تراشا اور جوہر کر دیا
شمع علم و آگہی سے دل منور کر دیا

استاد کے تئیں ایک اور نوجوان شاعر کے جذبات کو محسوس کریں:

یوں ہی نہیں ذرہ ذرہ قطرہ قطرہ کمال ہوئے ہیں
پاؤں دبائے ہیں استادوں کے تب جا کے نہال ہوئے ہیں

گمنامی کے اندھیرے میں تھا ایک پہچان بنا دیا
دنیا کے غم سے مجھے انھوں نے انجان بنا دیا

استاد کے احسان کا کر شکر منیر آج
کہ اہل سخن ہی تری تعریف بڑی بات

قصہ المختصر یہ کہ ہر ہنر کسی نہ کسی استاد سے سیکھا جاتا ہے خواہ وہ فن شاعری ہی کیوں نہ ہو۔ اردو کی نثری اصناف میں ہمارے ادیبوں نے اساتذہ سے رہنمائی حاصل کی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ بعض اساتذہ تو صرف اپنے شاگردوں کی وجہ سے کافی مقبول ہوئے۔ حضرت داغ دہلوی کے تلامذہ تو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ خط وکتابت کے ذریعہ بھی اپنے شاگردوں کے اشعار کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ یہ وہی حضرت داغ ہیں جنھیں اقبال نے بھی اپنے کلام بھیجے تھے مگر داغ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس میں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔

دور حاضر میں ترسیل کی بے پناہ ترقی نے استاد اور شاگرد کے رشتے کو اور زیادہ وسیع اور بامعنی بنا دیا ہے۔ آج آپ واٹس اپ اور دوسرے سوشل میڈیا کے ذریعہ دنیا میں کسی کو بھی آپ استاد بنا سکتے ہیں اور بغیر حسن اصلاح اپنے شعر تخلیقات ان کو بھیج سکتے ہیں اردو میں تو ایسے اساتذہ کی تعداد بھی معقول ہے جو اپنے شاگردوں کو غزلیں لکھ کر دیا کرتے تھے اور مشاعروں میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کراتے تھے۔

بہر حال زمانہ خواہ کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے لیکن استاد کا نہ کوئی متبادل ہے اور نہ ہوگا اور شعری کائنات میں استاد کی اہمیت سے انکار مظاہر فطرت سے انکار کرنے کے برابر ہے۔

□□□

**Dr. Farzana Khalil**
F-148/1,
Shaheen Bagh
Okhla
New Delhi-110025

ڈاکٹر قیصر جہاں سیط اللہ

# مروّت کا چراغ

# ڈاکٹر محمد کلیم ضیا

اللہ رب العزت نے ہم انسانوں کو فہم و فراست اور قوت گویائی عطا کر کے اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا ہے۔ بنی نوع انسان خدا کی عطا کردہ انہی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر متعدد زبانوں کا مالک بن چکا ہے۔ آج اس وسیع و عریض زمین پر مختلف زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ نت نئی زبانوں وادبی فن پاروں کی تخلیق ہو رہی ہے۔ جس میں ہماری اردو زبان بھی شامل ہے۔

ادب جسے زندگی کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ہر دور کے ادبا و شعرا نے اپنی بیش بہا تخلیقات سے اردو ادب کے خزانے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اردو ادیب و شاعر کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس طویل ترین فہرست میں ایک اہم مقام ڈاکٹر کلیم ضیا کا ہے۔ ڈاکٹر کلیم ضیا اردو ادب کی مشہور شخصیات میں سے ایک ہیں۔ بحیثیت نقاد، مضمون نگار، افسانہ نویس، نظم گو، غزل گو اور قطعہ نگار کے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بیش بہا تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کو نئے رنگ و آہنگ عطا کیے ہیں۔ خود ان ہی کے الفاظ میں:

ادب شعور کے سانچے میں ڈھال کر ہم نے
جدید طرز سے کہنہ رواج بدلا ہے
ادب کو حُسنِ حقیقت سے آشنا کر کے
ادب کے حُسن کا ہم نے مزاج بدلا ہے

یہ مقالہ چونکہ ڈاکٹر کلیم ضیا کی قطعہ نگاری سے متعلق ہے لہٰذا یہاں ان کی قطعہ نگاری پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ قطعہ نگاری دراصل وہ صنف نظم ہے جس میں کوئی شاعرانہ خیال تسلسل کے ساتھ دو یا دو سے زیادہ

اشعار میں ادا کیا جاتا ہے۔ غزل کی طرح قطعہ میں بھی ردیف اور قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ البتہ غزل کی طرح قطعہ میں مقطع کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں زیادہ تر دوشعری قطعات کا چلن عام ہے۔ متعدد شعرائے اردو نے قطعہ نگاری کے ذریعے ہی شہرت حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کم وبیش 200 سے زائد قطعات لکھے ہیں جو اردو قطعات کے خزانے میں قیمتی موتی سے کم نہیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قطعات مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ انھوں نے اپنے قطعات میں موجودہ دور کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

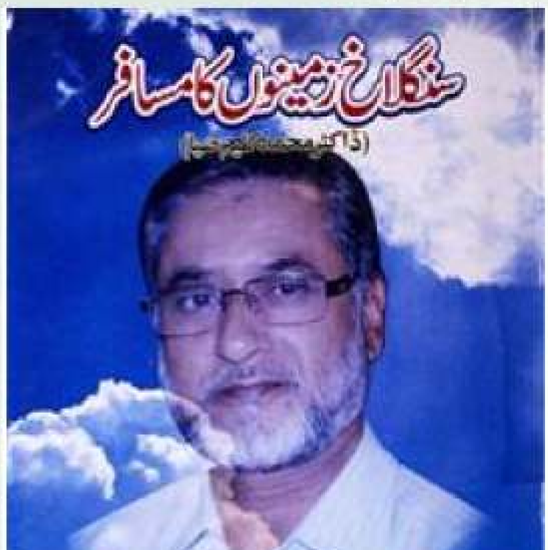


فن کار اپنے سماج کا بہترین نباض ہوتا ہے۔ اس کی نظر تیز، مشاہدہ عمیق اور مطالعہ وسیع ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن پارے میں سماج کا عکس بخوبی پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر کلیم ضیا نے بھی اپنی شاعرانہ فن کاری سے سماج میں پھیلی ہوئی اخلاقی گراوٹ اور انسانی رشتوں کی پامالی کو بے نقاب کیا ہے۔ انسانی رشتے دراصل زندگی کی اساس ہوتے ہیں۔ رشتوں کی مضبوطی کی بنیاد محبت، ایثار اور اعتماد پر ہوتی ہے۔ لیکن ان کی قدر ومنزلت دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ اس تلخ حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عرفان و آگہی نے سنورنا سِکھا دیا
گہرائیوں کی تہہ میں اُترنا سکھا دیا
رشتوں کی سب حقیقتیں جب کھل گئیں ضیا
دِل نے خود اپنے آپ سے ڈرنا سِکھا دیا

اخلاقی گراوٹ کے ساتھ ساتھ غریبی، مفلسی، بے روزگاری، مہنگائی اور بیماری نے زندگی کو بے رونق کردیا ہے۔ روز بروز بڑھتے ہوئے مسائل نے لوگوں کے حوصلے پست کردیے ہیں۔ انسانی زندگی کی نبض تھمتی جارہی ہے۔ ایسے پُرخطر حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے نئے عزم و حوصلہ کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ہمت کر آسماں نظروں میں آجائے گا پل بھر میں
اِرادوں میں بلندی ہے تو سَر اپنا اُٹھا کر دیکھ
ترے اطراف میں انوار کی بارش سدا ہوگی
توانائی کو مثبت سمت میں کچھ تو لُٹا کر دیکھ

ڈاکٹر صاحب نے اپنے قطعات میں اپنے عہد کے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تلخ تجربات ومشاہدات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اپنے ذاتی حالات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دریچے اب تلک روشن ہیں میرے اپنے ماضی کے
مجھے ہے خوف مستقبل کی ہیبت ناک ظلمت کا
مرے حالات میرے حال سے ملتے نہیں لیکن
مجھے بخشا گیا ہے جوش چٹانوں کی ہمّت کا

ڈاکٹر صاحب طویل عرصہ تک درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ موصوف نے اپنی علمی قابلیت وصلاحیت کے ذریعے نہ صرف نونہالانِ قوم کو علم کے زیور سے آراستہ کیا بلکہ انھیں روزمرہ کی زندگی میں کامیابی وکامرانی کا ہنر بھی سکھایا۔ انھوں نے اپنے منصب ومرتبے سے ہمیشہ انصاف کرنے کی کوشش کی۔ اپنی علم دوستی اور پُرخلوص شخصیت کی وجہ سے وہ اپنے حلقے میں بہت مشہور ومعروف رہے اور اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے قطعات میں علم کی اہمیت اور فرض معلّمی کو بہت ہی خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے یہ قطعات عوام میں بہت مقبول ہوئے اور آج زبان زدِ خاص وعام ہیں:

عِلم نے دے کے بہرحال سہارا مجھ کو
حُسنِ تہذیب و تمدّن سے سنوارا مجھ کو

میں تو سائنس تھا ضیا مجھ کو یہ معلوم نہ تھا
علم کر دے گا مچلتا ہوا پارا مجھ کو
میں معلّم ہوں کہ تدریس ہے میرا شیوہ
نا مہذّب کو میں تہذیب کی ضو دیتا ہوں
میری ہستی ہے ضیا خلق و مروّت کا چراغ
میں زمانے کو نئے عزم کی لَو دیتا ہوں

ڈاکٹر صاحب کے قطعات میں غزل کا رنگ و آہنگ بھی پایا جاتا ہے۔ عشق و محبت کے موضوعات جو غزل کا خاصہ رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کلیم ضیا نے عشقیہ مضامین کو اپنے قطعہ میں بہت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ جس سے ان کے قطعات میں تغزل کا عنصر در آیا ہے:

نگاہوں میں بساتا ہے بسا کر چھوڑ دیتا ہے
دِکھاتا ہے مجھے جو راہ اُس کو موڑ دیتا ہے
اُسے اپنی محبت کا یقیں خود ہی نہیں شاید
وہ شیشہ دیکھتا تو ہے مگر پھر توڑ دیتا ہے

ڈاکٹر صاحب کا حلقۂ احباب کافی وسیع ہے اور وہ اپنے حلقے میں بھی ہر دل عزیز رہے ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں ایسے قطعات بھی ملتے ہیں جو انھوں نے اپنے دوستوں کے لیے لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے قطعات ایسے ہیں جو انھوں نے خاص خاص موقعوں پر کہے ہیں۔ بالخصوص ''عید'' کے موقع پر کہا گیا یہ قطعہ بہترین نمونہ ہے:

ماہِ صیام ختم ہوا عید آ گئی
پیغام بہاروں کا چمن کو سُنا گئی
ہر دل پہ کیف طاری ہے سب شاد ہیں ضیا
گردوں پہ اِک گھٹا سی مَسرت کی چھا گئی

ڈاکٹر کلیم ضیا نے اپنے دوست نور امروہوی اور ساتھی پروفیسر علیم مختارے کی شخصیت پر بہترین قطعہ تحریر کر کے حق دوستی ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس سے ان کی انسان دوستی اور دوست نوازی صاف ظاہر ہوتی ہے۔

(نور امروہوی۔ امریکہ)

تہذیب کے امیں ہیں مہذّب لباس ہے
لفظوں میں چاشنی تو زباں پر مٹھاس ہے
امریکہ میں بھی کرتے ہیں خدمت زبان کی
اردو کو آپ جیسے جیالوں سے آس ہے

(مرحوم پروفیسر محمد علیم مختارے صاحب۔ صدر شعبۂ عربی و اسلامیات، اسماعیل یوسف کالج ممبئی)

وہ چراغوں سا ہواؤں میں جلا کرتا ہے
تیرگی ذہنوں کی وہ دور کیا کرتا ہے
وہ عمارت نہیں، قوموں کا بناتا ہے نصیب
نور ہی نور زمانے کو دیا کرتا ہے

الغرض ڈاکٹر کلیم ضیا اردو قطعہ نگاری کا اہم اور درخشاں نام ہے۔ جدید شعرا میں بطور قطعہ نگار منفرد مقام ہے۔ ضیا صاحب کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ زبان و بیان اور انداز کی شیرینی نے ان کے قطعات کو بہت ہی پراثر بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشعار اور قطعات کی گونج مختلف محفلوں اور مقابلوں میں سنائی دیتی ہے۔ ☐☐☐

**Dr. Quaiser Jahan Saitullah**
Al-Falah Urdu High School,
Kurar Village, Pathan Wadi,
Malad (East),
Mumbai - 400 097 (M. S.)

ابرار احمد اجراوی

# میرال الطحاوی

## کا ناول 'خیمہ': تعارف و تجزیہ

میرال الطحاوی مصر کی خاک سے ابھرنے والی روشن خیال، انقلاب پسند، باغی اور اصلاح پسند خاتون ناول نگار ہیں۔ وہ جواں عمر تو نہیں، ادھیڑ عمری کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہیں، مگر انھوں نے اپنی دلچسپ فکشن نگارشات سے عربی زبان کے عہد شباب کی یاد تازہ کر دی ہے۔ انھوں نے مختصر کہانیوں کے ذریعے عربی کے ادبی حلقوں میں جو شناخت قائم کی ہے، اپنی فکشن نگارشات میں انھوں نے عرب معاشرے کے جن سلگتے مسائل کو مس کیا ہے، اس کے تناظر میں وہ ایک سن رسیدہ اور پختہ کار تخلیق کار معلوم ہوتی ہیں۔ وہ 1968 میں دریائے نیل کے ڈیلٹا میں واقع صوبے الشرقیہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا گھرانہ روایت پسند، مثالیت نواز، فرسودہ مشرقی روایات پر کاربند اور قدیم طرز زندگی پر عمل پیرا تھا، انھوں نے اسی روایتی ماحول میں آنکھ کھولی اور ان کی پرورش بھی اسی فرسودہ قدیم روایتی ماحول میں ہوئی، گھر کی بوڑھی عورتوں اور خادماؤں کے درمیان گھٹن بھرے زنان خانے میں، جہاں نہ لب کشائی کی جرأت تھی، نہ اظہار خواہش کا حق۔ اس عہد میں صنف نازک کی پرورش کے معاملے میں عربوں میں یہی رواج تھا۔ البتہ تعلیم کے معاملے میں ان کے والد خاصے کشادہ دل اور زمانہ شناس واقع ہوئے تھے۔ ان کے والد پیشے سے ڈاکٹر تھے، جنھوں نے تعلیم کے باب میں مساوات پسندی کا ثبوت دیا اور صنفی امتیاز کے بغیر اپنی اولاد ذکور و اناث سب کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔

میرال الطحاوی نے مصر کی قاہرہ یونی ورسٹی میں پڑھائی کی۔ عربی زبان میں ماسٹرس کی ڈگری حاصل کی۔ اور وہیں عربی زبان کی تدریس میں مصروف بھی ہیں۔ وہ ایک باغی اور آمادۂ احتجاج تعلیم یافتہ فکشن نگار ہیں، وہ روایتی بندشوں اور نام نہاد سماجی اصول وضوابط کو توڑنے میں یقین رکھتی ہیں، اس بغاوت اور روایت شکنی کی ابتدا بھی انھوں نے کہیں اور سے نہیں، بلکہ اپنے گھر خاندان، اپنی ذات اور اپنے اطراف سے ہی کی، برسوں سے ان کے خاندان میں یہ معمول چلا آرہا تھا کہ خاندان اور قبیلے میں ہی لڑکیوں کا عقد نکاح کیا جاتا تھا، مگر میرال الطحاوی نے اپنے قبیلے سے باہر شادی کر کے اس غیر انسانی اور فرسودہ روایت کے دیو ہیکل بت کو

توڑا۔ میرال الطحاوی کا خانوادہ بھی پڑھا لکھا ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ان کے خاوند بھی عربی کے مشہور اور مقبول شاعر ہیں۔

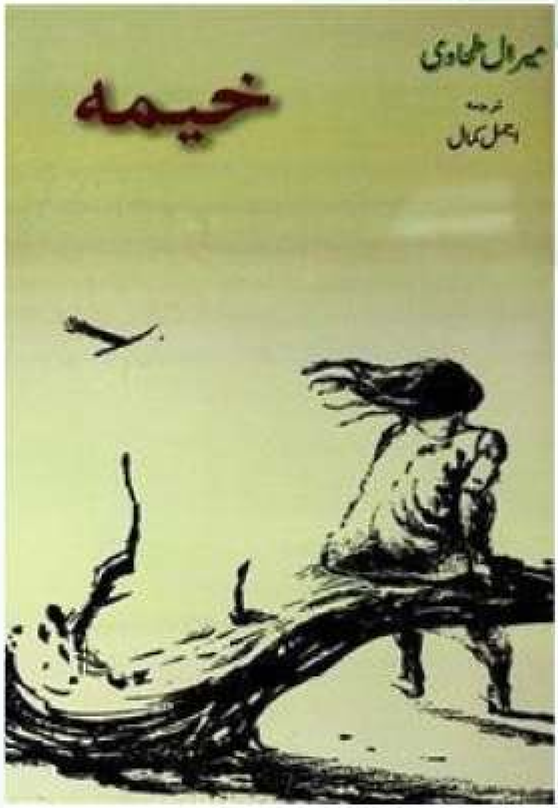


میرال الطحاوی کا ناول ''الخباء'' بہت مشہور ہے، عربی ناولوں میں ایک شاہ کار، ایک غیر روایتی موضوع پر لکھا گیا ناول، جو 1996 میں شائع ہوا تھا۔ اور اپنی اشاعت کے زمانے میں ہی بحث کا مرکز بنا تھا۔ اس ناول کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ تادم تحریر زائد از چھ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ اس ناول میں پہلی بار مصنفہ نے عرب بدوؤں کی ایسی تصویر پیش کرنے کی جرأت کی ہے جو عوام الناس کے ذہنوں میں جاگزیں عام اور فرسودہ تصویروں اور روایتی انداز سے بالکل جدا ہے۔ اسی مقبولیت کے مدنظر اس کا ترجمہ اجمل کمال نے انگریزی متن کی مدد سے کیا ہے۔ ''خیمہ'' میرال الطحاوی کا ایک سماجی اصلاح پر مبنی ناول ہے۔ ایسا ناول، جس میں قدامت پسندی، روایت پرستی، صنفی اونچ نیچ، طبقاتی تفریق، لڑکیوں پر غیر ضروری سماجی پابندی، اوہام پرستی کے علاوہ دیگر سماجی بندشوں اور برائیوں کو موضوع بحث بنا کر ان کی بیخ کنی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار نے جہاں عرب بدوؤں اور دہقانیوں کی زندگی کی جھلک دکھائی ہے، وہیں صنفی امتیازات پر تنقید کے ساتھ ساتھ تانیثیت اور نسائیت کے فروغ و استحکام کی طرف بھی اپنے قلم کی رو کو موڑا ہے۔ آج ہی نہیں ماضی میں بھی تانیثیت کے فروغ پر بے شمار عرب اور ہندوستانی فکشن نگاروں نے اپنی توجہ مبذول کی ہے۔

جہاں تک ''خیمہ'' کی بنیادی کہانی کا تعلق ہے تو وہ انتہائی گنجلک ہے، سرسری طور پڑھنے پر مرکزی کہانی کا احساس نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں نہ ابھرنے کی وجہ سے شروع سے آخر تک کہانی میں ایک قسم کا بکھراؤ، عدم مرکزیت اور ثقالت کا احساس ہوتا ہے، یہ عقدہ جلدی نہیں کھلتا کہ مرکزی کردار فاطمہ ہی اس کہانی کا مرکز و محور ہے اور اسی پر پوری کہانی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ گرچہ کہانی کے بین السطور میں مرکزی کردار فاطمہ کے ذریعے بہت سے ایسے مسائل کو ابھارنے کی کوشش کی گئی، جو نہ یہ کہ صرف عرب بدوؤں سے مربوط رہے ہیں، بلکہ یہ کسی نہ کسی حد تک عرب و عجم کے عام معاشرہ میں بھی بہت تیزی سے سر ابھار رہے ہیں۔ اس کی کہانی کے دروں سے ابھرنے والا درد نہ صرف عرب کے ریگستانوں کی افسوس ناک صورت کا عکاس ہے، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ پورے عالم انسانیت کا المیہ ہے۔ یہ کہانی عالم عرب کی تصویر ہے، نئی تہذیب سے متاثر ہونے کا اعلامیہ ہے، صرف عرب اور مصر ہی نہیں، بلکہ یکساں طور پر پوری دنیا کے روایت پسند افراد کی ذہنیت اور تجدد پسند افراد کے درمیان ٹکراؤ کی عکاس ہے۔

اس ناول کی کہانی کچھ یوں ہے کہ فاطمہ نامی لڑکی اپنی پیدائش کے چند برسوں بعد سے ہی آزاد فضا میں سانس لینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا ذہن ہمیشہ اسی ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ نہ صرف اس کو بلکہ پورے انسانی معاشرے خصوصاً خواتین کو تمام تر بندشوں سے آزادی کس طرح نصیب ہو۔ سماجی اور روایتی بندشیں تو ہر معاشرہ میں کسی نہ کسی سطح پر پائی جاتی ہیں، مگر عرب بدوؤں اور مصر کے صحرانشینوں میں جیسی سماجی بندشیں تھیں، وہ انتہائی سخت، قابل نفریں اور نا قابل برداشت تھیں۔ طرہ اس پر یہ کہ وہاں کے عام افراد ایسی بندشوں کی زنجیریں توڑنے پر توجہ بھی نہیں کرتے ہیں۔ لہٰذا فاطمہ نامی لڑکی اپنی نوعمری سے ہی مصری صحراؤں میں پلنے بڑھنے والی نسل کو آزاد دیکھنے کی خواہش مند نظر آتی ہے، وہ اپنے معاشرہ کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتی ہے۔ انتہائی آزادی کے ساتھ نہ سہی، اس کا خواب ایک روز پورا ہوتا ہے، اس کی فکری اور عملی کوششوں سے صحرا کے افراد کی ذہنیت بدلتی ہے، اور نئی نسل کو تعلیم اور جدید تہذیب کی صحت مند روشنی میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

12/ابواب میں منقسم اس ناول کی کہانی حقیقت پر مبنی ہے، اس کہانی کا تانا بانا خلا میں نہیں بنا گیا ہے، بلکہ اس کہانی کے سارے کردار اسی زمین اور فضا سے ابھرے ہیں اور ہمارے حقیقی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناول میں کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ناول نگار نے اپنے کرداروں کو داستانوی یا مافوق الفطری بنانے کی کوشش کی ہو۔ فاطمہ کی باتوں اور اس کی جدت پسند طبیعت سے معاشرہ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہوتی رہی، اس کی قدامت پسند دادی 'حاکمہ' نے ہر موڑ پر اس کی مخالفت کی، اس کے پیروں میں زنجیر ڈالنے کی کوشش کی، تاہم دادی کے انتقال کے بعد ہی سہی اس کی انقلابی کوششیں رنگ لانے لگیں اور آزادی کی مدھم کرنوں سے مصری معاشرہ مستفید و منور ہونے لگا۔ ناول نگار چاہتیں تو فاطمہ کے کردار کو تیز رفتاری کے ساتھ انقلابی بنا دیتیں اور ایسا محسوس ہوتا کہ چند برسوں میں یہاں کے لوگوں کی ذہنیت بدل گئی، مگر شاید دانستہ طور پر ناول نگار نے ایسا کچھ نہیں کیا، کیوں کہ انقلابی لہر بسا اوقات پانی کے بلبلے کی طرح اٹھتی ہے اور سرد پڑ جاتی ہے، اگر کسی انقلاب کی لہر سرد پڑ جائے تو پھر معاشرہ سست رو ہو جاتا ہے، وہاں کے لوگ سرد مہری کے شکار ہو جاتے ہیں، یعنی انقلاب کے بجائے سرد مہری کی فضا چھا جاتی ہے، اگر کوئی کام بتدریج ہو تو اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے، اس سے منفی اثرات کے مرتب ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے، یعنی سرد انقلاب ایسا انقلاب ہوتا ہے کہ سرد مہری پیر نہیں پسارنے پاتی ہے۔ شاید اسی ذہنیت کے مدنظر ناول نگار نے تشدد کی راہ نہیں، بلکہ سرد اور سبک خرام انقلاب کی تکنیک کو اپنایا ہے۔

اس ناول کے مرکزی اور ضمنی کرداروں کی زبانی اور ان کی حرکت و عمل سے اور بھی کئی موضوع سے قاری آشنا ہوتا ہے۔ ناول کا پس منظر انقلابی تو ہے، مگر اس کے علاوہ بہت سی معاشرتی برائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان معاشرتی برائیوں کی موجودگی کی وجہ سے ناول عربی معاشرہ اور مصری سماج کا آئینہ دار بن گیا ہے۔

دیگر معاشرتی برائیوں سے قطع نظر صنفی امتیاز کا عنصر اس ناول کا سب سے قابل توجہ پہلو ہے۔ کیوں کہ ایک طرف ناول نگار نے فاطمہ کے باغیانہ تیور سے تانیثی محرکات کو بڑھاوا دینے کی طرف داری کی ہے، وہیں دوسری طرف اسی معاشرہ میں لڑکیوں سے تنافر کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ ناول کا یہ تضاد ناول کی دلکشی اور اس کی اثر انگیزی میں معاون ہے۔

صنف نازک سے منافرت کی ذہنیت تو آج سے ہی نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے پائی جاتی ہے۔ مگر اسلام کی آمد کے بعد ہر مذہب اور معاشرہ میں ایسی ذہنیت پر قدغن لگی، باوجود اس کے آج بھی ڈھکے چھپے ہر ملک اور ہر معاشرہ میں یہ ذہنیت فروغ پا رہی ہے۔ مادر رحم میں صنف نازک کا قتل عام بات ہے، لڑکیوں کی ولادت پر رشتہ داروں کے ماتھے پر شکن پڑنا موجودہ معاشرے کی پہچان بن چکی ہے اور انھیں بنیادی ضروریات سے محروم رکھنا اور ان کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھنا ہمارا معمول بن گیا ہے۔ ناول نگار نے شاید اس مسئلہ کو اپنے ناول میں اجاگر کر کے یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہو کہ زمانہ جاہلیت کی صنفی تفریق پر مبنی ذہنیت سے آج بھی عرب بدوؤں کو نجات نہیں ملی ہے۔ صنفی نابرابری کے تناظر میں اس ناول کے کئی ایک واقعات خونچکاں ہیں۔ پے در پے لڑکے کے ضائع ہونے کی وجہ سے فاطمہ کے والد کی دوسری شادی ہوتی ہے، مگر اس کے بطن سے بھی لڑکے کی پیدائش کی خواہش کی تکمیل نہیں ہو پاتی ہے، اسی خواہش کے تحت تیسری عورت سے نکاح کیا جاتا ہے، مگر تقدیر کے آگے سب بے بس، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ناول میں اس ذہنیت کی قباحت مزید اس طرح اجاگر ہوتی ہے کہ بار بار لڑکی پیدا ہونے کی وجہ سے پہلی بیوی کو جبراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، یعنی وہ فطری موت مرتی نہیں بلکہ مرکزی کردار فاطمہ کے والد اپنی ماں (فاطمہ کی دادی) کی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ سے گلا دبا کر اسے موت کی نیند سلا دیتے ہیں:

> "بالکل اس طرح جیسے ابا کو اماں کا گلا گھونٹتے دیکھا تھا، دادی نے ہی ان سے کہا تھا کہ اماں کے بدن پر جھک کر انھیں مار ڈالیں، لیکن ہر بار جب وہ ایسا کرنے کی کوشش کرتے، انھیں اماں کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دے جاتا اور وہ ان پر رحم کھا کر اپنے کمرے میں لوٹ جاتے۔ ساسا نے بھی انھیں اماں کا گلا گھونٹتے ہوئے دیکھا تھا، کئی دفعہ۔ جب ابا نے اماں کو کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا تب بھی وہ نہیں مریں، مرنے والے صرف لڑکے تھے"۔ (خیمہ، صفحہ 68)

اس اقتباس سے کئی مسئلے، حقیقت کی شکل میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ دوسری طرف عورتوں کی نرم دلی اور خدا ترسی بھی سامنے آتی ہے کہ عورتوں میں ایسے نفوس بھی ہیں، جو عورت کی مظلومیت سے دل برداشتہ ہیں، مگر حالات ایسے ہیں کہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔

فاطمہ کے والد نے اولاد نرینہ کی خواہش میں تین تین شادیاں کر لیں پھر بھی کسی کی کوکھ سے لڑکا پیدا نہیں ہوا، اس واقعہ پر ناول نگار نے معاشرہ پر بڑا تلخ طنز کیا ہے کہ اگر بیٹے کی پیدائش نہ ہو تو اس میں عورتوں کا ہی قصور کیوں ڈھونڈا جاتا ہے، اول تو مشیت الٰہی پر ہی یہ سب منحصر ہے، مگر مان بھی لیا جائے کہ انسانی نطفے کا کرشمہ بھی ہوتا ہے تو صرف عورت کو ہی قصوروار

کیوں مانا جائے، ہوسکتا ہے کہ مرد میں بھی کمی ہو، اس کے اندر جرثومہ کی قلت ہو، جس کی بنیاد پر بیٹے کی پیدائش نہ ہو پاتی ہو، اگر صرف عورتوں کا قصور ہوتا تو تین تین عورتیں بدل گئیں، تین عورتوں سے شادی ہوئی، مگر پھر بھی مایوسی، لہٰذا دادی حاکمہ کو صرف بہوؤں پر ہی غصہ نہیں اتارنا چاہیے، بلکہ مرد یعنی اپنے بیٹے کے معاملہ پر بھی سوچنا چاہیے، گویا ناول نگار نے یہ طنز کر کے معاشرہ کو خود اپنا احتساب کرنے اور سوچنے پر مجبور کیا ہے:

"اس کے لیے (یعنی دوسری بیوی کے لیے) باہر کھیتوں میں ایک الگ مکان بنایا گیا، لیکن بیٹے تب بھی مرتے رہے، اس کے چار بیٹے ضائع ہوئے، آخر میں اس نے ابا سے کہا: تمھاری اولاد ہی منحوس ہے، تم کبھی بیٹے کے باپ نہیں بن سکو گے، چاہے عربوں کی ساری بیٹیاں بھی بیاہ لاؤ"۔

(خیمہ: صفحہ 86)

اس ناول کا ایک اور دردناک معاشرتی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک گھر اجڑ جائے تو دوسرا گھر بھی اجڑ جاتا ہے۔ اور اس بربادی کا مرکز وہ گھرانے ہوتے ہیں، جہاں گولٹ شادی ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ دو مختلف گھرانے سے بھائی بہن ہوتے ہیں، اِس طرف کی بہن سے اُس طرف کے بھائی اور اِس طرف کے بھائی سے اُس طرف کی بہن کی شادی کر دی جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی گھر کے دو بھائی بہن ایک گھر میں بیاہ دیے جاتے ہیں۔ یہ رواج ہمارے ہاں غیر مسلموں میں تو نہیں، مگر مسلم معاشرے میں بہت زیادہ ہے۔ عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ اگر معاملہ میں کوئی تلخی آتی ہے تو دونوں گھر بربادی کے قریب آجاتے ہیں، بلکہ عملی طور پر اجڑ بھی جاتے ہیں، حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ جس رشتے میں نباہ نہیں ہو رہا ہے، وہ رشتہ منقطع ہو مگر طیش و غضب اور جذبۂ انتقام میں اس رشتہ میں تلخی لانا یا سرے سے اس کو جذبات میں آکر منقطع کر لینا، کہاں کی عقلمندی ہوگی، جس میں کوئی تلخی نہ ہو، کوئی رنجش نہ ہو، ازدواجی رشتہ کے نباہ میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ ناول میں ایسی رشتہ داری اور ایسی ذہنیت پر بھی طنز ہے، وہ اس طرح کہ فوز اور صافیہ کی شادی ایک ہی گھرانے میں ہوئی تھی، ماں کے انتقال کے بعد فوز اور صافیہ دونوں میکے آئیں، فوز تو جلد واپس ہوئی، مگر صافیہ جلد لوٹنا نہیں چاہتی تھی، کیوں کہ فاطمہ سمیت کئی اور بچیاں تھیں، جن پر صافیہ کو ترس آتا، اس لیے سسرال جانے میں کچھ دنوں ٹال مٹول کرتی ہے، اس لیے صافیہ اور فوز کے گھر والوں کو یہ سننا پڑتا ہے:

"آخر کار فوز آئی، اس کا پیٹ پھولا تھا اور..... اس کا شوہر اس کے ساتھ نہیں آیا، اس کی جگہ اس کا سسر آیا، اور وہ غصے میں تھا، اس نے اپنی واسکٹ کی جیب سے کوئی مٹھائی نہیں نکالی، نہ میرے ساتھ خرگوش کے کانوں کا کھیل کھیلا، اس نے ابا سے سخت لہجے میں بات کی ..... اب تمہاری دونوں بیٹیاں تمہارے گھر واپس آگئی ہیں، اب تم یا تو ان دونوں کو ایک ساتھ واپس بھیجو گے، یا دونوں کی اس گھر میں ان کی دیکھ بھال کرو گے..... اگلے ماہ میں اور میرا بیٹا شادی کر رہے ہیں، اگر تمہاری نہیں تو کسی اور کی بیٹیوں سے"۔ (خیمہ: صفحہ 64)

مانا کہ صافیہ شوہر کے گھر نہیں جانا چاہ رہی تھی، وجہ چاہے کچھ بھی ہو، اس کا واپس ہونا صحیح ہو کہ غلط، مگر فوز کی کیا غلطی تھی، اس کو یہ سزا کیوں مل رہی تھی کہ شوہر سے الگ کر کے اس کے سسر نے باپ کے گھر بھیجنے کی ٹھان لی تھی، جب کہ فوز امید سے تھی اور وقت بھی پورا ہونے والا تھا، یہ تو اور بھی قابلِ رحم حالت تھی، مگر اس کے سسر نے ایک خود تراشیدہ سماجی برائی کو اس رشتے میں جگہ دے دی۔ واقعی یہ بری روایت آج معاشرے میں گھر کرتی جا رہی ہے، جس کا سدِ باب ضروری ہے۔

معاشرہ کی کئی برائیوں اور توہم پرستی کو بھی اجاگر کرنے کی ناول میں کوشش کی گئی ہے، اس لیے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ ناول معاشرہ اور معاشرتی امراض کا بھرپور عکاس ہے، اس کے تانے بانے میں معاشرہ کو پرو دیا گیا ہے۔

فنی نقطۂ نگاہ سے اس کا مطالعہ کرتے وقت سب سے پہلے اس کے کرداروں سے مباحثہ و مکالمہ قائم کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ کئی ایک حوالے سے اس کے کردار توجہ طلب ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس ناول کے بیشتر کردار نسوانی ہیں۔ فاطمہ، فوز، صافیہ، این، موحہ، زہوہ، ساسا، سقیمہ، سردوب، راحات، سُموات، حاکمہ وغیرہ۔ مردوں کے کردار بہت ہیں۔ مسلم، والد، غلام اور فوز اور صافیہ کے سسر۔ تعداد کے لحاظ سے بھی نسوانی کردار زیادہ ہیں اور کردار کی ادائیگی کے لحاظ سے بھی۔ ناول نگار نے فاطمہ کے کردار میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے، مرکزی کردار واقعی مرکزی کردار نظر آتی ہے۔ انھوں نے جہاں فاطمہ کے کردار میں تانیثی رجحان کے فروغ پر اپنی توجہ مبذول کی ہے، وہیں رومانیت بھی کسی حد تک اس میں راہ پاتی نظر آتی ہے۔ رومانیت کو معاشرتی تناظر میں باغیانہ تیور کا بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ رومانیت میں اگر بغاوت کا کوئی عنصر نہ ہو، تو صحیح معنوں میں رومانیت کی دلکشی ختم ہو جاتی ہے۔ فاطمہ جس انداز سے معاشرہ میں انقلاب لانے کی کوشش کر رہی تھی، اس میں جہاں انقلابی عنصر

ہے تو وہیں انقلابی تیور بھی، قدامت پسندی سے بیزاری اور اس کی بات بات پر دادی کا چراغ پا ہونا، اس بات کی علامت ہے کہ رومانیت کسی نہ کسی سطح پر جگہ پا گئی ہے۔

کردار کے تعلق سے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ایک ہی ساتھ رہنے والے کئی ایک کردار ایسے ہیں، جن کی وضاحت نہیں ہو پاتی ہے کہ وہ مرکزی کردار فاطمہ کی کون ہے؟ یا پھر کس سے کس کی کیا رشتہ داری ہے؟ فوزا اور صافیہ کے تعلق سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ فاطمہ کی بہنیں ہیں۔ سقیمہ مسلم کی بیوی ہے۔ راحات فاطمہ کے والد کی دوسری بیوی ہے۔ مگر موحہ، سردوب کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کون ہیں۔ فاطمہ سردوب سے سب سے زیادہ قریب رہی ہے، اس کے کردار کی وضاحت ضروری تھی، اسی طرح 'این' نام کے کردار سے بھی کوئی تعلق واضح نہیں ہوتا ہے، حالانکہ اس کے اندر آزادی کی لہر پیدا کرنے میں اس کا ہی کردار سب سے زیادہ اہم ہے، گویا سردوب اور این سب سے زیادہ فاطمہ سے قریب نظر آتی ہیں، مگر ان دونوں کا کردار بجھا بجھا سا لگتا ہے۔ ان میں کوئی تحرک اور تفاعل نہیں۔

جہاں تک منظر نگاری اور مکالمہ نویسی کا تعلق ہے تو موقع محل کے اعتبار سے انتہائی دلچسپ منظر نگاری کی گئی ہے اور مکالمہ نگاری بھی۔ زبان بھی صاف شستہ شگفتہ ہے، البتہ پلاٹ انتہائی پیچیدہ ہے، جس سے کہانی سمجھنے میں پریشانی ہوتی ہے اور قارئین کو قرأت متن کے دوران کئی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ البتہ کہانی کے اختتام تک آزادی کی کرن نمودار ہوتی نظر آنے لگتی ہے، اپاہج فاطمہ کا خواب پورا ہونے لگتا ہے، کیوں کہ اس کی سوتیلی بہنیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر جانے لگتی ہیں، حالانکہ اس کی دادی کے انتقال سے پہلے یہ سب ممکن نہیں تھا، دادی چھوٹی موٹی بات پر بھی قدامت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے راہ کا روڑا بن جاتی تھی۔

"دو چھوٹی لڑکیاں اب بڑی ہو گئی تھیں، اپنے ہاتھوں میں کاپیاں سنبھالے وہ گدھے پر بیٹھ گئیں اور محافظ انھیں اسکول لے گیا جو بہت دور، پہاڑیوں کی دوسری طرف واقع تھا، راحات سوچتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ انھیں جاتی دیکھتی رہی اور پھر بولی، ذرا سوچو فاطمہ، اگر تمہاری دادی یہ دیکھ لیتی تو کیا ہوتا، وہ دروازے کو ان لڑکیوں کے خون سے رنگ دیتی، وقت کی ہوا ہر شے کو اڑا لے جاتی ہے"۔ (خیمہ 96)

یہ پیراگراف انقلابی تناظر میں ناول کی جان ہے۔ یہیں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ بدوؤں نے بھی تعلیم سے قرابت و قربت کا اظہار کیا ہے، قدامت پسندی کے سایے سمٹتے جا رہے ہیں، فاطمہ جس آزادی کے لیے سوچ رہی تھی، اس کے لیے راہیں ہموار ہو رہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فاطمہ کے پردے میں اپنے مشاہدات و تجربات سے لوگوں کو بہرہ مند کرنے والی میرال الطحاوی پیغام دے کر انقلابی لہر پیدا کرنے میں کامران نظر آتی ہیں۔

مختصر یہ کہ 'خیمہ' صرف فاطمہ کی نہیں، سارے عرب بدوؤں کی کہانی ہے، وہی عرب بدو جو گدھوں، اونٹوں، گھوڑوں اور بھیڑ بکریوں کے بیچ زندگی گزارنے کے عادی رہے ہیں۔ وہ انسانی آبادی سے دور جنگلوں اور بیابانوں میں ہی رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شہر کی چکاچوند اور بھاگ دوڑ سے بہت دور۔ اس ناول کا مرکزی کردار فاطمہ صیغۂ واحد متکلم کے ذریعے گاؤں دیہات کی لڑکیوں اور صنف نازک میں ابھرنے والی فطری آزادی کی ترجمان ہے۔ وہ اس راہ میں اپاہج اور معذور ہو جاتی ہے، مگر ہر وقت فطری آزادی اور تخیل و فطری خواب کی آغوش میں جینا چاہتی ہے کہ یہی اس کی الجھنوں اور ذہنی کوفت اور دل آزار کا آخری مداوا ثابت ہوتا ہے۔ لڑکیوں اور بچیوں سے نفرت کا جو جدید معاشرے میں رجحان پروان چڑھ رہا ہے اس پر بھی اس ناول میں سخت چوٹ کی گئی ہے۔ لیکن کیا فاطمہ اپنی پسندیدہ دنیا میں سانسیں لینے، کھل کر جینے اور من چاہی زندگی گزارنے میں کامیاب ہو جاتی ہے؟ نہیں، بلکہ آزادی کی جویا فاطمہ روایتی پابندیوں کے حصار کو توڑنے میں ناکام رہتی ہے۔ وہ قصے کہانیوں کے بل پر تخیل کی فضا میں ضرور پرواز کرتی ہے، مگر معاشرے کے ایسے دوسرے باغی اور انقلابی انسانی کرداروں کی طرح اس کے مقدر میں بھی رفتہ رفتہ خاک میں مل جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ناقدین نے ناول کے مرکزی کردار فاطمہ کو ناول نگار کی شخصیت کا پرتو بھی مانا ہے۔ اسی لیے ترجمہ نگار نے یہ لکھا ہے کہ:

"اس ناول میں بیان کیے گئے واقعات کی بنیاد میرال کے اپنے تجربے اور مشاہدے پر ہے، اور اس کے مرکزی خیال سے ناول نگار کی ذاتی وابستگی اس ناول کے انتساب سے عیاں ہے: "میرے جسم کے نام... خیمے کی کیل جو صحرا میں مصلوب ہو گئی۔" (سہ ماہی آج ترتیب: اجمل کمال، شمارہ: 42، خزاں، جولائی-ستمبر 2003)

□□□

**Abrar Ahmad**
At+Post Ijra
Via, Raiyam Factory
Dist.Madhunbani-847237 (Bihar)

محمد شفیع بھٹ

# قرۃ العین حیدر

## کے ناولوں میں مشترکہ تہذیبی عناصر

ہندوستان عہدِ عتیق سے ہی جذبِ مقناطیسی کی طرح دنیا کے مختلف انواع واقسام کے اقوام کو اپنی طرف کھینچتا رہا ہے۔اس مقناطیسی کشش میں یہاں کے سرسبز و شاداب میدان، زرخیز زمین، دلکش آب وہوا، جغرافیائی ماحول، خوشگوار فضا وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔اس سوادِ اعظم نے اپنے آب وہوا کے حُسن و جاذبیت کے باعث نہ صرف وارد ہونے والے گروہوں کو متاثر کیا بلکہ بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم بھی کیا۔ہندوستان میں جن اقوام نے ورود پایا ان میں تاجر، خانہ بدوش پیش پیش ہیں۔ان قوموں میں بعض واپس چلے گئے اور بعض اس ملک کے عظیم الشان منظروں سے اس قدر قائل ہوئے کہ ہندوستان کو ہی اپنی آخری پناہ گاہ متصور کرکے یہی کے ہو رہے۔

ہندوستان میں دنیا کے مختلف ومتنوع بیرونی قافلوں کی آمد کے سلسلے میں فراق گورکھپوری نے اپنے کلام میں کچھ یوں فرمایا ہے:

سرزمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراق
قافلے آتے گئے ہندوستان بنتا گیا

سرزمینِ ہند کے قدیم ترین باشندے نیگرائڈ اور پروٹو آسٹرولائڈ یا آسٹرک نسل کے لوگ ہیں جو جنوبی افریقہ سے غذا کی تلاش میں یہاں وارد ہوئے۔ان قدیم ترین نسلوں کا تعلق قدیم ہجری عہد اور نو ہجری عہد سے ہے۔ان پرانے لوگوں کے علاوہ ہندوستان کی طرف اور بھی کئی قومیں تلاشِ معاش کے مقصد کی غرض سے یہاں آئی ہیں جن میں دراوڑ، یونانی، ہیون، کُشن، تُرک، تاتاری، ایرانی، تورانی اور سب سے آخر میں انگریز نمایاں طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

دنیا کے مختلف النوع قبیلے گروہ در گروہ اس ملک میں داخل ہوئے اور یہاں کی مٹی میں اس طرح پیوست ہوئے کہ اپنے اور غیر میں

تفاوت باقی نہیں رہا۔ باہر سے آنے والے گروہوں کے لوگ مختلف و منفرد تہذیبوں کے نمائندے تھے لیکن ہندوستان میں مستقل قیام کے بعد اپنی الگ تہذیب کے نمائندے ہونے کے باوجود انھیں یہاں کے لوگوں کی تہذیب وتمدن سے متصادم ہونا پڑا۔ دونوں نے اپنی الگ الگ تہذیبوں کے باوجود باہمی اشتراک و ارتباط اور اخذ وقبول سے ایک مشترکہ بود وباش، طرزِ معاشرت، رہن سہن اور طرزِ زندگی اختیار کرلی اور یوں اختلاط وامتزاج کے اس پیہم عمل نے آہستہ آہستہ ایک نئی تہذیب یعنی مشترکہ تہذیب کو جنم دیا۔

قرۃ العین حیدر اُردو فکشن کی ایک عبقری اور کثیر الجہات شخصیت کی مالک ہیں۔ ان کی شناخت حق گو اور بے باک تخلیق کار کی ہے۔ مشترکہ تہذیب قرۃ العین حیدر کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ان کے فن پاروں بالخصوص ان کے ناولوں میں مشترکہ تہذیب کا رنگ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اُردو ادب کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں ناول، افسانے، رپورتاژ، سفرنامے، خاکے اور کالم نگاری وغیرہ شامل ہیں۔ اُردو فکشن ان کا خاص میدان رہا ہے۔ جس کے لیے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ اُردو ناول نگاری کے فن کو جن ناول نگاروں نے فکر وفن کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا، ان میں قرۃ العین حیدر کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ یہ اُردو ادب میں ہمیشہ سے ایک چیلنج رہی ہیں۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے نہ صرف ناول کے کینوس کو زمانوں اور رنگوں پر پھیلا کر تاریخیت کی نئی تخلیقی جہات کو روشن کردیا ہے بلکہ افسانوی ادب کو بھی ایسی سوچ، ایسا ذہن اور ایسا انٹلکچوئل ذائقہ دیا ہے جس سے اُردو زبان کو مشاعرے کی زبان سمجھنا اُردو کی توہین کرنا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو نثر نے جس طرح اپنی حیثیت پر اصرار کیا ہے ان میں قرۃ العین حیدر پیش پیش ہیں۔ ان کا فکشن اُردو میں ایک نئی ذہنی اُفق کا درجہ رکھتا ہے۔''

(کتاب نما 12، دہلی، ستمبر 2000)

قرۃ العین حیدر نے تقسیم ہند کے بعد اُردو ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں تقسیمِ ملک اور ہجرت کے المیوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ناول دو عالمگیر جنگوں سے اُبھرنے والے بین الاقوامی مسائل کے آئینہ دار بھی ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان کی جذباتی، ثقافتی اور روحانی قدروں کو متزلزل کردیا ہے۔ بٹوارے کے بعد برصغیر کی معاشرتی زندگی جس اخلاقی زوال اور اقدار کی شکست وریخت سے دوچار ہوئی۔ انسانی رشتوں کی بے وقعتی کے درد ناک پہلو جس طرح حقیقت بن کر ہمارے سامنے آئے ان کی جیتی جاگتی تصویریں قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ عینی آپا کی جس ماحول میں پرورش و پرداخت ہوئی تھی وہ محبت کے نغموں کی موسیقی، نفاستوں اور نزاکتوں کی رنگارنگی، ہندو مسلم اتحاد سے پُر تھا۔ لیکن ان کی تحریروں میں دم توڑتی ہوئی تہذیب وتمدن، تاریخ، وقت کا تغیر وتبدل، انسانوں کی ناقدری، اقدار کی پامالی وغیرہ کی صورت میں اُبھر کر سامنے آگئے۔

''میرے بھی صنم خانے'' 1948 قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے۔ ناول کا موضوع تقسیمِ ہند، ہندو مسلم مناقشات اور صدیوں پُرانی مشترکہ تہذیب کی شکست وابتری ہے۔ جس مشترکہ تہذیب کو وجود میں آنے میں ہزاروں سال لگے تھے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''''میرے بھی صنم خانے'' کے متعلق خود قرۃ العین حیدر کا خیال ہے کہ اس میں انھوں نے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلم بند کی ہے۔ یہ المیہ ہندوستان کی تقسیم ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا اور ایسے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو ختم کیا گیا جو صدیوں کے اتحاد اور باہمی رشتے سے پیدا ہوا تھا۔''

(ڈاکٹر اسلم آزاد، اُردو ناول آزادی کے بعد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2017، ص 39)

عینی آپا کے دیگر اہم اور بہترین ناولوں میں ''سفینۂ غمِ دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہم سفر''، ''گردشِ رنگ چمن'' اور ''چاندنی بیگم'' بھی ہیں جن میں تقسیم کا دُکھ، مشترکہ قدروں کا بحران، سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل کا پتا بحسن وخوبی ملتا ہے۔ ان متنوع پہلوؤں کی عکاسی ان کے شاہکار ناول ''آگ کا دریا'' 1959 میں جابجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ناول میں دراصل قرۃ العین حیدر نے وقت کو ایک عظیم طاقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ وقت ایک ایسی طاقت ہے جس کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کی ہزاروں برس کی تاریخ، فلسفہ اور تہذیب ومعاشرت کو سمیٹ لیا ہے۔ اس ناول کو اگر ہندوستانی تہذیب وتاریخ کی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں بھرپور طریقے سے ہندو مسلم کلچر کی ہم آہنگی اور برصغیر کی تقسیم کے عوامل

پر تفصیلی بحث کی ہے۔غرض یہ ناول بدھ دور کی تہذیب سے شروع ہوتا ہے۔سلطنتوں کے دورِ حکومت اور مغلیہ دورِ حکومت کا ہندوستانیوں کی زندگی پر کیا اثر پڑا سب کو سمیٹتا ہوا ہندوستانیوں کی تقسیم تک آتا ہے۔اس طرح ان مختلف ادوار کے واقعات کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں مشترکہ تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں سامنے آتی ہیں۔

انگریزوں کے ظلم و بربریت،آزادی کی خاطر برسوں کی مسلسل جدوجہد،معصوموں اور بے قصوروں کی قربانیوں کے بعد غلام ہندوستان کو آزادی تو ملی لیکن اس اندوہناک عہد کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔آزادی اور تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی ہندوستان اور پاکستان کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔اس تقسیم کے باعث نہ صرف خون کے رشتے اور انسان دوستی کے رشتے ٹوٹ گئے بلکہ برسوں پرانی گنگا جمنی تہذیب اور مذہبی رواداری کا خاتمہ بھی ہوگیا۔اس طرح ''سفینۂ غمِ دل'' 1952 میں بھی قرۃالعین حیدر نے مشترکہ تہذیب وتمدن کے بکھرتے شیرازہ کو پیش کیا ہے۔

''آخرِ شب کے ہم سفر'' 1979 میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔موضوع کے لحاظ سے اس ناول کا کینوس وسیع ہے۔ناول کا آغاز متحدہ ہندوستان کے صوبۂ بنگال کی تہذیبی،معاشرتی اور سیاسی فضا سے ہوا ہے۔1942 کی تحریکِ بنگال کے انقلابیوں اور دہشت پسندوں کے واقعات،تحریکِ آزادی میں مختلف قوموں کا جذبۂ ایثار،تقسیمِ بنگال اور اس کے زیرِ اثر فرقہ واریت کا فروغ،مسلم لیگ کا قیام،جنگِ عظیم کے اثرات،تقسیمِ ہند اور بنگلہ دیش کا قیام وغیرہ جیسے موضوعات اس ناول کے وسیع دائرے میں آتے ہیں۔عینی آپا نے اس ناول میں بنگالی کلچر اور بنگلہ زبان سے بنگالی مسلمانوں کی محبت ومودت اور جانب داری کی لہر کو بھی قلم بند کیا ہے جو برصغیر کی تقسیمِ ثانی کا ایک اہم سبب بنی۔انھوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ جنگِ آزادی سے ہی بنگالی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بنگالی کلچر اور بنگلہ زبان وادب کی دلدادہ تھی۔نواب قمرالزماں اور دیپالی سرکار کا تبادلۂ خیال سے کچھ ایسا ہی خاکہ سامنے آتا ہے۔

ناول ''گردشِ رنگِ چمن'' (1988) قرۃالعین حیدر کا ایک اور اہم ناول ہے۔مصنفہ نے تاریخ کے تناظر میں 1857 کے ہنگامہ خیز زمانے سے ناول کا آغاز کیا ہے جو سیاسی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے بھی ایک انقلابی صورتِ حال کا نقطۂ آغاز بنتا ہے۔پورا ناول دلی،کلکتہ،دوسری اور تیسری دہائی کا شاہی لکھنؤ،جے پور اور پھر جدید لکھنوی تہذیب میں سفر کرتا نظر آتا ہے۔تہذیبی تبدیلیوں کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو مذکورہ ناول کا بنیادی موضوع قرار دیا جاسکتا ہے۔اس طرح عینی آپا نے قدیم اور جدید تہذیبی قدروں کا تصادم،انسانی ارتقا اور مشترکہ تہذیب کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

''چاندنی بیگم'' عینی آپا کا آخری ناول ہے جو 1990 میں شائع ہوا تھا۔اس میں بھی مصنفہ نے اپنے پسندیدہ موضوع ہندوستان کے مشترکہ کلچر،تقسیم،ہجرت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا احاطہ کیا ہے اور خاندانوں کے بکھرنے اور ٹوٹنے کی کہانی کو بھی ساتھ ساتھ پیش کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرۃالعین حیدر نے تقسیمِ ہند،آزادی کے زیرِ اثر فرقہ وارانہ فسادات اور خون آشام واقعات کی بنا پر فرد کی تنہائی اور جلاوطنی،اودھ کی جاگیردارانہ تہذیب کا زوال،مشترکہ تہذیب وثقافت کی پامالی وغیرہ جیسے متنوع موضوعات کو اپنے ناولوں میں چابکدستی اور ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔میں اپنی بات اقبال مجید کے ذیل کے قول پر ختم کرتا ہوں:

> ''اس حقیقت سے سب ہی واقف ہیں کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی آرائش اور زیبائش میں ہندوستان کے صوفیائے کرام کا زبردست ہاتھ ہے جنھوں نے ملک کی سیکولر قدروں کو مضبوط کیا تھا،عینی آپا پر اس فکر وفلسفہ کی گہری چھاپ رہی ہے۔اور یہ رجحان کسی نہ کسی شکل میں ان کی تحریروں میں جھانکتا نظر آتا ہے۔اس درگاہی کلچر کی مخالفت کرنے والوں پر ان کو افسوس ہوتا تھا اور وہ اس کو ایک اینٹی سیکولر رویہ سمجھتی تھیں جس کا اظہار وہ تحریری طور پر بھی کرچکی ہیں۔''

(اقبال مجید،''ہاؤسنگ سوسائٹی'' چند معروضات کی روشنی میں،مشمولہ:قرۃالعین حیدر نمبر،نیادور،فروری،مارچ،2009،ص15)

□□□

**Mohd Shafi Bhat**
Senior Research Fellow
Dept of Urdu
Kashmir University-190006 (J&K)
contact:9797836702
email:bhattshafi786@gmail.com

ثنا شمشاد صدیقی

# اردو ذریعہ تعلیم میں سماجی علوم کی تدریس

## مسائل اور امکانات

کسی بھی مضمون کے لیے اکتساب کا سب سے بہترین ذریعہ مادری زبان ہوتی ہے۔ مادری زبان سے مراد وہ زبان ہے جس پر اطراف کا ماحول اثر انداز ہوتا ہے اور جسے انسان اپنے سماج میں رہتے ہوئے سیکھتا ہے۔ زبان ہماری تہذیب اور ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے۔ آئین کی دفعہ (a)(1)19 میں آزادیِ اظہار رائے کا ذکر ہے جس کے مطابق ہر شہری کو بولنے اور اپنی رائے رکھنے کی آزادی ہے، خواہ وہ زبانی ہو، تحریری ہو یا تصویر یا پینٹنگ کی شکل میں ہو۔ لکھنے اور بولنے سے مراد وہ زبان ہے جس میں ہم اپنا مافی الضمیر دوسروں پر واضح کرسکیں۔ ظاہر ہے ہر شہری اس آزادی کا استعمال اپنی مادری زبان میں ہی کرنا چاہے گا۔ لیکن بین الاقوامی سطح پر انگریزی کی مقبولیت کے زیر اثر معاشی حالات اور سماجی روابط کو بحال رکھنے کے لیے اس کا استعمال ناگزیر ہے۔

سماجی علوم کے انسان اور سماج سے متعلق ہونے کی وجہ سے اس کے دائرے میں وہ تمام مضامین آتے ہیں جن کا براہ راست تعلق انسان اور سماج سے ہو۔ یہ انسانی معاملات اور تعلقات سے وابستہ علم ہے جس میں سماجی معاملات اور اقدار پر زور دیا جاتا ہے۔ سماجی علوم ہماری زندگی کے لیے بہتر راہیں فراہم کرتا ہے اور اس کا بنیادی مقصد فرد کی بہتر نشوونما کر کے ایک اچھا شہری بنانا ہے۔

سماجی علوم کے ذیل میں جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات کے شعبے آتے ہیں اور یہ چاروں کسی بھی بہترین معاشرے کی تشکیل کے بنیادی عناصر ہیں۔ جس طرح انسان سماج پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح سماج بھی انسانوں پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ لہٰذا اپنی سماجی حیثیت کو متعین کرنے کے لیے فرد مؤثر زبان کو اپنی مادری زبان پر فوقیت دیتا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ انسان کو سماج میں گزر اوقات کے لیے سماج کی زبان بولنی ہوتی ہے۔ وہ انگریزی بول کر سماج میں Socialize نہیں ہو سکتا ہے، لیکن صرف Socialize ہونا ہی انسانی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی معاشی ضرورت بھی ہے، اور جب ملک کی معاشی ضروریات کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو وہاں انگریزی زبان کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے۔

زبان کے مطالعے سے قطع نظر علمی مضامین میں درس و تدریس کا معاملہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر انگریزی سے منسلک ہے۔ دنیا میں تقریباً 1500 ملین لوگ انگریزی زبان بولتے ہیں جبکہ 104 ملین (جس میں 61 ملین مادری زبان کے طور پر اور 43 ملین دوسری زبان کے طور پر بولتے ہیں) کی تعداد کے ساتھ اردو بولنے والے لوگوں کا زبانوں کی فہرست میں دنیا میں انیسواں مقام ہے۔ لیکن درس و تدریس کے معاملے میں یہ تناسب غیر متوازن دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا ذریعہ تعلیم میں درپیش مسائل نے ہر میدان میں اردو کی نمائندگی کو کمزور ثابت کیا ہے جس کے کچھ سماجی اور معاشی پہلو بھی ہیں۔

آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔لہٰذا انسانی زندگی پر اس کے ذریعے پڑنے والے اثرات کے لیے کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ہر شخص اپنی زندگی میں کسی نہ کسی طریقے سے سائنس کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے۔ہمارے روزمرہ کے کاموں میں ٹیکنالوجی کے دخل کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبے متاثر ہوئے ہیں۔لہٰذا تعلیم اور درس و تدریس کے میدان میں ہونے والی تبدیلیوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے درس وتدریس اور اکتساب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔خاص طور سے انفارمیشن کمیونی کیشن ٹکنالوجی نے درس وتدریس کی دنیا کا رخ ہی بدل دیا ہے۔اس کی وجہ سے روایتی فرسودہ طریقوں کی جگہ نئے اسلوب وزاویے ملتے ہیں۔خاص طور سے سماجی علوم کی تدریس میں کمپیوٹر وٹکنالوجی کی بدولت نہ صرف درس و تدریس کے طریقوں میں تبدیلی رونما ہوئی بلکہ نئے طریقہ ہائے تدریس نے سماجی علوم کی پیچیدگیوں کو آسانی سے سمجھنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔اس میں سب سے اہم کردار آئی سی ٹی کا ہے۔

ICT سے مراد Information and Communication Technology ہے۔یعنی وہ تمام ٹکنالوجی جن کا تعلق معلومات کو جمع کرنے ،ترسیل اور تجزیہ کرنے میں کیا جاتا ہے، مجموعی طور پر آئی سی ٹی کہلاتی ہے۔یا یوں کہیں کہ معلومات کو Digital شکل میں ٹکنالوجی کے ذریعے عوام تک پہنچانے کا عمل آئی سی ٹی کہلاتا ہے۔لہٰذا اس میں انفارمیشن اور کمیونی کیشن کے دو الگ الگ جز مل کر ایک نئی اصطلاح کو جنم دیتے ہیں۔اگر ICT سے کمیونی کیشن کو الگ کر کے دیکھا جائے تو صرف انفارمیشن ٹکنالوجی باقی رہ جاتا ہے۔یعنی معلومات تو ہوگی لیکن اس کی ترسیل لوگوں تک نہیں ہوگی، لہٰذا ان دونوں کو ساتھ میں استعمال کرنے سے اس کے تصور میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

سماجی علوم کی تدریس میں ICT نے مختلف ذرائع سے جس طرح تبدیلی رونما کی اس کے لیے ایک طویل مضمون درکار ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ریکارڈ، کمپیوٹر، انٹرنیٹ کے ذریعے نہ صرف ان علوم کو فروغ ملا ہے بلکہ آسانی سے دور دراز میں ہونے والے کانفرنس اور پروگراموں تک رسائی بھی ہوئی ہے۔جس کے ذریعے درس وتدریس کو موثر بنانے میں بھی کافی مدد ملی ہے۔تکنیکی رفتار کی وجہ سے قدیم طریقہ تدریس کے مقابلے آج کا منظر بہت تبدیل ہو چکا ہے۔اسمارٹ کلاس روم، اسمارٹ بورڈ اور مجازی کمرۂ جماعت نے درس وتدریس کو آسانی فراہم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے ای لرننگ (E-Learning) اور ویب لرننگ (Web Learning) نے سماجی علوم کی تدریس کو آسان کر دیا ہے۔جس کی وجہ سے اب بھاری بھرکم کتابوں کی بجائے صرف ایک لیپ ٹاپ (Laptop) میں تمام معلومات کو جمع کر کے رکھا جا سکتا ہے۔پاور پوائنٹ (Powerpoint) نے کلاس میں تدریس کو مزید

آسانیاں فراہم کی ہیں جس کی وجہ سے اساتذہ ایک Powerpoint Presentation یا PPT کے ذریعے کم وقت میں طلبا کو زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرسکتے ہیں۔ ویڈیو کانفرنسنگ (Video Confrencing) کے ذریعے تعلیم کو دور دراز علاقوں تک پہنچانے میں بھی ICT نے کافی اہم رول ادا کیا ہے، جس سے سماجی علوم کے تمام مضامین کو بین الاقوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

آئی سی ٹی کے میدان میں آنے والی غیر معمولی تبدیلیوں کے باوجود اردو ذریعہ تعلیم میں سماجی علوم کی درس و تدریس کے مسائل ختم نہیں ہوئے ہیں۔ اس سے متعلق مسائل اور ان کے امکانات پر یہاں روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ درس و تدریس کے میدان میں مواد کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے اور استاد اور شاگرد کے درمیان مواد ہی وہ ذریعہ ہے جو کمرۂ جماعت کے باہر طلبا کی رہنمائی کرتا ہے، عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ سماجی علوم میں اردو میں دستیاب مواد کی حد بندیوں کی وجہ سے درس و تدریس کا معاملہ متاثر ہوتا ہے۔ اردو میں سماجی علوم کا جو مواد موجود ہے وہ زیادہ تر دوسری زبانوں سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس بات کا انحصار ترجمہ نگار کی مہارت پر ہے کہ اس نے کس طرح کی موزوں یا غیر موزوں زبان کا استعمال کیا ہے۔ اگر ترجمہ دلچسپ نہ ہو تو طالب علم اس کو پڑھنے میں دلچسپی نہیں لے گا۔ اس کے علاوہ اگر تخلیقی مواد کتابوں کی شکل میں موجود ہے تو اس پر سالہا سال نظر ثانی نہیں کی جاتی ہے۔

اساتذہ کا انگریزی کی طرف جھکاؤ بھی طلبا کی عدم دلچسپی کی وجہ بنتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم میں تدریس دینے والے اساتذہ اپنے مضامین کو انگریزی رسائل میں شائع ہونے کو قابل فخر سمجھتے ہیں۔ چونکہ انٹرنیٹ پر دستیاب مواد زیادہ تر انگریزی زبان میں موجود ہے لہٰذا اساتذہ References کے لیے انھیں انگریزی کتب کا حوالہ دیتے ہیں اور یہ سلسلہ طلبا کی شکل میں آنے والی نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔

سماجی علوم کے مضامین میں نصاب کا تعین انگریزی نصاب کی طرز پر کیا جاتا ہے تو مواد کی کمی کی وجہ سے وہاں بھی امدادی کتب میں انگریزی کی کتابوں کا نام دیا جاتا ہے۔ نصاب کا بہترین تعین اسی صورت میں ممکن ہے جب اپنی زبان میں بھرپور مواد موجود ہو۔

اساتذہ کی اردو سے بے رغبتی بھی تدریس کے میدان میں ایک بڑا مسئلہ ہے۔ چونکہ اردو مادری زبان برائے نام ہو کر رہ گئی ہے اور اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں اس کی جگہ انگریزی زبان نے لے لی ہے، لہٰذا طلبا کو پڑھانے کے لیے اردو کے ساتھ انگریزی کو ملا کر بلکہ زیادہ تر انگریزی میں ہی پڑھاتے ہیں۔ ایسا کرنے کے پیچھے کئی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن اردو ذخیرۂ الفاظ کی کمی بھی اساتذہ کے لیے ایک بڑا چیلنج (Challange) ہے۔

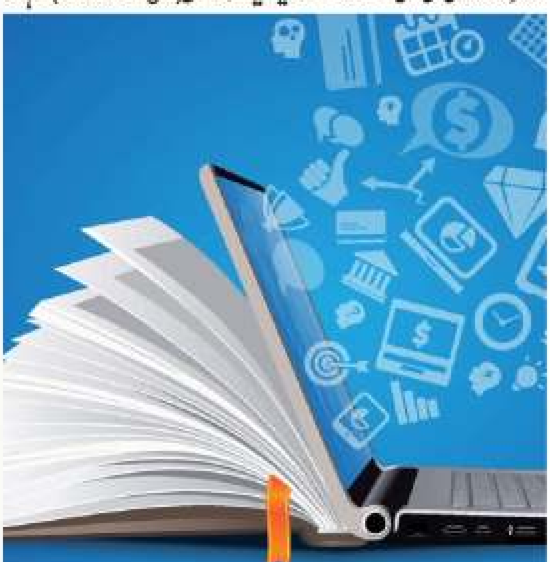

سماجی علوم کا تعلق سماجی مسائل سے ہے اور اس کی تدریس میں علم کے ساتھ تجربے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اساتذہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں اردو زبان کا استعمال کم کرتے ہیں لہٰذا کمرۂ جماعت میں ان تجربوں اور سماجی مسائل کو اردو زبان میں بیان کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے اور

جب ان کے جملوں میں اردو الفاظ دم توڑنے لگتے ہیں تو وہ انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہیں۔

تحقیقی مقالات (Research Thesis) کا انگریزی میں شائع ہونا اور اردو مقالے کو برائے نام ڈگری کی حد تک محدود کرنا بھی سماجی علوم کی تدریس میں ایک حد فاصل قائم کرتا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں سماجی علوم کے تمام شعبوں میں اردو کے ساتھ انگریزی کا مقالہ جمع ہونا ضروری ہے۔ چونکہ باہر سے آنے والے ممتحن اردو سے نابلد ہوتے ہیں، ایسے میں اردو مقالے کے تئیں اسکالر کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور انگریزی کی طرف توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ سماجی علوم سے متعلق رسائل کی کمی کے باعث اسکالرس اپنے مقالات جمع کرنے کے لیے یو جی سی کے متعین قوانین کے تحت مقالہ بھی انگریزی میں شائع کرانے کو مجبور ہیں۔ سماجی علوم سے متعلق زیادہ تر سیمینار یا کانفرنس بھی انگریزی زبان میں منعقد ہوتے ہیں، لہٰذا وہاں پیش کیا جانے والا پرچہ بھی اردو زبان میں داخل نہیں ہو سکتا ہے۔

ان وجوہات کے علاوہ سماجی علوم میں ذریعہ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے روزگار کے مواقع بھی کم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا معاشی انتشار کی وجہ سے طلبا کی توجہ اردو سے ہٹ جاتی ہے اور وہ موجودہ روزگار کے پیمانوں کو پورا کرنے کے لیے دوسری زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

اردو درسگاہوں میں نوکری یا داخلہ کے لیے ہونے والے انٹرویو میں گفتگو کا میڈیم اردو کے بجائے انگریزی ہوتا ہے، ایسے میں تمام علمی مضامین میں اردو مواد کی دستیابی بے سود ہے اور یہ امر قابل افسوس ہے۔

تجربہ گاہوں کی کمی بھی سماجی علوم کی تدریس میں ایک بڑا مسئلہ ہے۔ زیادہ تر درسگاہوں میں تجربہ گاہ موجود نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو وہاں موجود Equipments اردو میں موجود نہیں ہوتے۔

ان تمام مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں اس بات پر توجہ دینی ہوگی کہ اردو میں موجود مواد کو کیسے بہتر بنایا جائے۔ ترجمہ نگاری کے میدان میں کیسے بہتر اقدامات کیے جائیں۔ موجودہ دور انٹرنیٹ کا دور ہے لہٰذا قابل اساتذہ کے ذریعے ویڈیو وغیرہ بنا کر انٹرنیٹ پر ڈالا جائے تاکہ طلبا اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اردو میڈیم اداروں میں اردو تعلیم کے لیے Orientation Programme کرائے جائیں، مزید یہ کہ سماجی علوم کی الگ الگ فرہنگیں مرتب کی جائیں تاکہ سماجی علوم کی اصطلاحات کو اردو میں آسانی سے فراہم کیا جا سکے۔ وقتاً فوقتاً اساتذہ کی مہارت کو نکھارنے کے لیے Refresher Courses کرائے جائیں تاکہ علمی مضامین میں آنے والے تمام مسائل کا حل نکالا جا سکے۔ اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے لیے روزگار کے تئیں اعتماد قائم کیا جائے تاکہ وہ اپنے معاشی مسائل کو بالائے طاق رکھ کر اردو زبان میں اپنے تعلیمی کارناموں کو انجام دے سکیں۔

□□□

**Sana Shamshad Siddiqui**
Research Scholar
Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P)

افسانہ

رخشندہ روحی مہدی

# خوشبو کا سفر

"اے سی کا ٹمپریچر 18 کر دو" عاطف نے نیند میں ڈوبی ہوئی بوجھل آنکھیں میری پشت میں گڑاتے ہوئے کہا اور کروٹ دیوار کی طرف بدل لی۔ہمارے چہرے کشادہ بیڈروم کی رنگین جرمن پینٹ زدہ دیواروں میں نسب ہوگئے۔

کمرہ کافی گرم ہو رہا ہے۔میں گرمی میں زندگی کی حرارت ڈھونڈھتی ہوں اس لیے مجھے بہت زیادہ یخ کمرہ مردہ گھر لگنے لگتا ہے۔۔۔پر۔۔اب عاطف کی عادت! ۔بہر طور۔میں نے اے سی 18 ڈگری پر سیٹ کردیا۔

سائیڈ ٹیبل پر جلتے کریسٹل لیمپ شیڈ کے کٹس سے چھلکتی روشنی کی آڑی ترچھی بیضوی ڈائمنشنس نے ابھری ہوئی رنگین پلاسٹک کی لکیروں والی دیوار پر ایک بے ترتیب جال پھیلا دیا ہے۔ان خاموش موڈرن آرٹ کی قیمتی لکیروں میں۔فرنچ کریسٹل کٹس کے زاویوں میں ایک زاویہ۔جس کا کوئی ڈائمنشن نہیں۔میں ہوں۔۔

سعودی عرب کے خوبصورت شہر جدہ کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں جونیئر ڈاکٹر۔اور میرا کام ہر وہ کام ہے جو میرے پاس سعودی نیشنل ڈاکٹرز نہیں کرسکتے،اس لیے میری ڈیوٹی ایکسیڈینٹ کیسز کو ڈیل کرنے کی ہے کیونکہ ایکسیڈینٹ کا کوئی مقررہ وقت یا متعین جگہ نہیں ہوتی اور کسی بھی وقت ایمرجنسی کال آجاتی ہے۔یہاں کی حد درجہ تیز ڈرائیونگ انسانی چہروں کی پہچان بدل دیتی ہے۔بعض اوقات تو اس قدر ذہنی اذیت سے گذرنا پڑتا ہے کہ اپنے اس پیشہ سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔۔اور اپنی اس ایک غلطی کا احساس بڑھ جاتا ہے جو میں نے کی بھی اور مٹا بھی دی تھی۔اگر دل کی بات مان لی ہوتی تو۔۔۔آج ایک لیکچرر یا آرٹسٹ ہوتی۔

عاطف۔میرے شوہر! کیمیکل انجینئر ہیں۔ان کا کام میرے کام سے بالکل مختلف ہے اور کافی حد تک میرے کام سے کم بھی۔ان کو یہاں کا آرام و سکون عزیز ہے۔ان کی دنیا ان کی جنت۔۔یہ ملک! جہاں بقول ان کے ہمارے پاس ہر چیز کی قوت خرید ہے۔شاید سچے جذبات کی بھی!!

"کلک" جھنجھلاہٹ کے ساتھ بغیر کچھ کہے اسی کروٹ پر لیٹے لیٹے عاطف نے کرسٹل لیمپ کا سوئچ آف کر دیا۔منقش دیوار کے تمام زاویہ موڈرن آرٹ کی لکیروں میں الجھے اور مٹ گئے۔انھیں گھپ اندھیرے میں سونا پسند ہے اور میں۔۔اس اندھیرے سے دوستی کرتے کرتے اب سوتے میں بھی جاگنے لگی ہوں۔۔۔وطن سے دور اس لامتناہی ریگزار میں مردہ جسموں کے درمیان خود بھی ایک بے روح!! اس گھپ یخ بے جان اندھیرے میں میری دنیا آباد خوبصورت اور روشن ہو رہی ہے۔میری پکی سہیلی میری ہمراز۔۔میری اپنی دیوار۔۔۔مکمل خاموشی اور یکسوئی سے مری کہانی سن رہی ہے۔۔سات سال سے۔ہر رات! بڑے صبر سے۔تحمل سے۔۔

یونیورسٹی میں میرا داخلہ بی ایس سی آنرز میں ہوگیا۔ ایک قصباتی زندگی کے بعد ہوسٹل کی کھلی فضا۔۔ امی کے علاوہ اب اور کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ پاپا کے سیٹ کیے گئے ٹارگٹ پر نظر جماتے ہوئے ایم بی ایس سے متعلق کتابیں لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتی رہتی۔۔

ترتیب وار کتابوں کی دھول سے پاک شیلفوں کی لمبی قطاریں۔۔ اوران قطاروں کی درازوں سے جھانکتی لائبریری انچارج کی بے حد غصیلی تیز نگاہوں کی سرچ لائٹ۔۔۔ اس سخت ڈسپلن نما سناٹے میں ذہن صرف کتابوں کے علاوہ کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔۔

مگر۔۔ کبھی کبھی ایک لطیف سا خوشبو کا جھونکا اس سناٹے کو سہل بنا دیتا۔۔ پڑھائی سے دل اچاٹ جاتا اور دماغ اس مانوس مہک کو محسوس کرنے اور محظوظ ہونے میں بٹ جاتا۔ کافی جستجو کے بعد بھی میں اس لافانی خوشبو کو تلاشنے میں ناکام تھی۔ کلاس، ہوسٹل کا کمرہ یا پھر کینٹین۔۔ کہیں یہ مہک نہیں ملی۔۔ علاوہ لائبریری کی بالائی حصے کے۔۔ ڈاکٹری کی خشک کتابوں کے صفحات پلٹتے ہوئے میرا دل بے طرح اس مہک میں ڈوب جاتا۔ لیکن کہاں سے اس مہک کی لپٹ اٹھتی؟ میں نظریں گھماتی رہتی۔ کئی بار اٹھ کر ٹہلتی۔ آس پاس بیٹھی لڑکیوں کے قریب جا کے زور سے بے آواز سانس لیتی۔۔ لیکن۔ میری سانس اکیلی لوٹ آتی!

ہوسٹل میں میری روم میٹ ثمر بی اے یعنی آرٹس سائڈ کی طالبہ تھی۔ اسے شعروشاعری کا بیحد شوق تھا۔ وہ کتابوں میں سر دیے ہر نیا شعر مجھے ضرور سناتی اور تشریح بھی کرتی کہ میری سمجھ میں آجائے اور واقعی اس کے ساتھ رہنے سے مجھ میں بھی شعور بیدار ہوگیا۔ اردو سے لگاؤ محسوس ہونے لگا۔ ثمر کو انگلش بولنے کا جنونی شوق اس کی اور میری دوستی کی مضبوط کڑی بن گیا۔ میں اس کی انگریزی درست کرتے کرتے اردو اشعار ذہن نشین کرتی گئی۔ اور۔۔ ایک دن کسی نئے تازہ شعر کی تلاش میں ثمر کی اردو کلاس میں پہنچ گئی۔۔

چہچہاتے ہوئے اس نے میرا تعارف کرایا۔۔ ”ان سے ملیے۔۔۔ ڈاکٹر رعنا صاحبہ۔۔“

لیکن میں!! ڈوب رہی تھی ایک مانوس مہک کے حصار میں۔۔ دائیں بائیں چاروں طرف۔ میں لائبریری کے بالائی حصے میں تو نہیں ہوں۔۔

ثمر نے میرا ہاتھ زور سے دبایا۔

”کیا ہوگیا۔۔ سن تو لو“

”ہاں۔ جی۔ جی۔ میں رعنا۔۔ رعنا جبیں“

”آؤ بیٹھو“ ثمر نے خالی کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔

مجھے بے دھیان پا کر ثمر نے شرارتی انداز میں میرے کان میں سرگوشی کی۔

”جب پہلے پہل تجھے دیکھا تھا دل کتنی زور سے دھڑکا تھا وہ لہر نہ دل میں پھر جاگی وہ وقت نہ لوٹ کے پھر آیا“ مجھے کھویا ہوا پا کر کلاس میں ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

”یونہی وقت گنوایا موتی سا یونہی عمر گنوائی سونے سی
سچ کہتے ہو تم بھی ہم سخنوں اس عشق میں ہم نے کیا پایا“ ثمر نے پھر ہانک لگائی۔۔ اور مجھے زور سے جھنجھوڑ ڈالا۔۔ میں سانس لے کر ہانپ رہی تھی۔۔۔۔ میرے برابر والی کرسی خالی تھی۔۔

دوسری کرسی پر گورا اونچا خوبرو کچھ زیادہ ہی صحت مند ثمر کا کلاس میٹ بیٹھا تھا۔۔ وہ میری ڈاکٹری کے رعب میں ہرگز نہیں آ رہا تھا۔ بس مسکرائے جا رہا تھا۔

**’ھوسٹل میں میری روم میٹ ثمر بی اے یعنی آرٹس سائنڈ کی طالبہ تھی. اسے شعر وشاعری کا بیحد شوق تھا.وہ کتابوں میں سر دییہر نیا شعر مجھے ضرور سناتی اور تشریح بھی کرتی کہ میری سمجھ میں آجائے اور واقعی اس کے ساتھ رہنے سے مجھ میں بھی شعور بیدار ہو گیا.اردو سے لگائو محسوس ہونے لگا. ثمر کو انگلش بولنے کا جنونی شوق اس کی اور میری دوستی کی مضبوط کڑی بن گیا.میں اس کی انگریزی درست کرتے کرتے اردو اشعار ذھن نشین کرتی گئی.اور .. ایک دن کسی نئے تازہ شعر کی تلاش میں ثمر کی اردو کلاس میں پھنچ گئی ..‘**

کلاس میں سب کھڑے ہوئے۔۔ اور بیٹھ گئے۔۔ لیکچر شروع ہو گیا۔ میں کھڑی نہ ہوئی اور بیٹھی ہی رہ گئی۔۔ وہ بڑے سے رجسٹر میں نوٹس لکھے جا رہا تھا۔۔ جھکا ہوا سر گھنے کالے بال، ان بالوں سے زیادہ گھنی ذہین آنکھیں اور ان آنکھوں سے بہت زیادہ گھنی اس کی مسکراہٹ اور ان سب سے گھنی اس کی مہک !!!۔ وہ خوشبو جس کا نشہ پل پل مجھ میں گھر کر گیا

تھا۔ میں نے زور سے طویل سانس لی اپنے روئیں روئیں میں اسے بسا لیا۔ اس نے ایک لمحہ کو مجھے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔۔

ثمر میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے کھڑا کر چکی تھی۔ کلاس خالی تھی۔۔۔ وہ جا چکا تھا!!

میں اسی وقت اسکول کے آفس کی کھڑکی پر گئی اور سائنس سائیڈ کی جگہ آرٹس کے سبجیکٹ تبدیل کرا لیے۔ اردو آنرز۔۔ سبھی میں فائین آرٹس اور سائکولوجی۔

صبح آٹھ بجے کی کلاس میں ثمر کے ساتھ میں بھی اس کے برابر کی کرسی پر تھی۔ اس نے تھوڑا سا برہم ہو کر مجھے دیکھا۔۔ میں اپنے حواس میں کب تھی اس کے جسم کی انمول خوشبو میرے دل دماغ ہی کیا میرے ہاتھ پیروں کو بھی شل کر رہی تھی۔ وہ اٹھ کر تین قطاریں چھوڑ کر مجھ سے کافی فاصلے پر بیٹھ گیا۔۔

میں اپنے ہوش میں کچھ لوٹ آئی۔ ہنسی آئی اس کے بھولے پن پر۔ اچھا جی! دور جاؤ گے تو کیا خوشبو کے دھاروں کو باندھ کر مجھ سے دور لے جاؤ گے؟ منہ پھیر لوگے تو کیا تمھاری پشت سے کوئی دوسری بو پھوٹ پڑے گی؟ اونہہ! اچھا ہے کہ تمھیں اپنی اس خوبی کا علم نہیں ہے، یونہی اتنے مغرور ہو۔ اگر جان گئے کہ میں کیوں دیوانی ہوئی تو آسمان سر پہ اٹھا لوگے۔

گھنٹی بجی۔ اردو کا پیریڈ ختم ہوگیا۔ لمبے ڈگ بھر کر تم سب سے آگے نکل گئے اور جا کر میری شکایت پرنسپل سے کر آئے کہ میں نے سائنس سائیڈ سے آرٹس سائیڈ میں چھلانگ لگائی ہے۔

آج بھی ڈاکٹر رضیہ خان کی سرخ آنکھیں مجھے گھورنے لگی ہیں۔ امی کی کلاس فیلو ہونے کا اور میرا بھرپور خیال رکھنے کا اپنا وعدہ یاد دلاتے ہوئے انھوں نے سچ مچ میرا کان پکڑ کر مروڑ دیا تھا۔ اسی وقت کلرک کو بلوا کر اپنے سامنے میرے پہلے والے سبجیکٹ واپس دلوا کر بائیولوجی کی کلاس میں جانے کا حکم دیا تھا۔۔

کتنا بیگانہ پن تھا کلاس میں۔ مگر۔۔۔ میرے وجود میں تمھارا وہ ایک لمحاتی ساتھ تھا۔۔ بہت تھا کافی تھا۔

جہاں تم جاتے میں وہیں جاتی۔ مگر تم وہاں سے غائب اور میں تمھاری مہک میں دنیا سے غافل وہیں جم جاتی۔۔۔

تین سال اسی چھپن چھپائی کے کھیل میں گزر گئے۔ میرا بی ایس سی اور تمھارا بی اے آنرز پورا ہوگیا۔۔ ہم سب پاس ہوگئے۔ تم نے ٹاپ کیا تھا۔ میں صرف سیکنڈ ڈویژن لے پائی تھی۔ کالج بند ہوگیا۔ اور لائبریری بھی۔۔ تمھارے وجود کی گھنی مہکار کو سینے میں بھرنے کو ترستی رہی میں۔۔۔ تمھیں دیکھنے کو بھٹکتی رہیں میری نگاہیں۔

ہماری فیرویل پارٹی کی شام آگئی۔۔ آڈیٹوریم میں۔۔ وہی مدہوش کن مہک چکراتی پھر رہی تھی۔۔ تم پہلی قطار میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہنس رہے تھے۔ تمھیں میری موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ تم سے گانے کی فرمائش ہوئی اور تم نے اسٹیج کو سجا دیا اپنی لازوال مہک سے، گھنی مسکراہٹ اور بولتی آنکھوں سے، بکھرے بالوں سے، دل میں گھر کرتی آواز سے۔۔۔

”یہ رات۔۔ یہ چاندنی پھر کہاں۔۔ سن جا دل کی داستاں۔“

آڈیٹوریم سیٹیوں کی آواز میں ملی واہ واہ سے گونج گیا۔ تم اسٹیج سے اترے اور لائٹ گل ہوگئی۔۔ لڑکوں نے حسب عادت شور مچایا۔

**’آڈیٹوریم سے باہر بل کھاتی سرمئی پتلی سڑک پھوٹ پھوٹ کے روئی۔۔ کبھی اس کے سینے پر میں نے خوشبو سے ہواؤں پر تمھارا نام لکھا تھا۔ سامنے گول باغیچے کے وسط میں چھتری نما سایہ دار گل مہر اپنے پھولوں کی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں میں امڈ آئے آنسوؤں کو چپکے سے پی گیا۔ اس کے سرخ پھولوں کی مہک تمھارے وجود کے گرد بندھ کر تمھارے ساتھ جا چکی تھی۔ گل مہر صرف رنگ کا کیا کرے گا؟؟‘**

میں بھاگ کر راستے میں حائل کرسیوں کو پار کر گئی اور۔۔ کوشش کر کے تمھارے پاس کھڑی ہوگئی۔۔ میں تمھارے سامنے اور تم میرے سامنے۔۔ گھپ اندھیرا۔۔ صرف تمھاری خوشبو مہک اٹھی۔۔ میری سانسیں۔۔ لمبی سانسیں۔۔ لمبی سے لمبی۔۔ طویل سانسیں۔۔۔ تم کچھ تذبذب میں جھجک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ تمھاری جھکی ہوئی پیشانی پر ننھے منے آب دار سچے موتی ابھر آئے۔۔ میں نے سر کو زیادہ اونچا اٹھایا اور پورا زور لگا کر پنجوں کے بل کھڑی ہوگئی۔۔۔ اور۔ روشنی واپس آگئی۔ سب طرف۔۔ میرے دل کے ہر گوشے میں آڈیٹوریم کی چھت سے اتر کر سارے کے سارے قمقمے پلکیں جھپکاتے جھک سے جل اٹھے۔ روشنی سے منور یہ نئی دنیا کتنی عجیب تھی۔ جہاں میں تھی۔۔ تم تھے۔۔ تمھاری حیرت سے کھلی بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور۔۔ زندہ رہنے کے لیے تمھاری مہک

تھی۔تم مجھے سانسوں کے وقفے کے درمیان بھٹکتا چھوڑ اپنے دوستوں کے جھنڈ میں ہنستے باتیں کرتے میری طرف سے منہ موڑ کر آڈیٹوریم کے خارجی دروازے کے باہر نکل گئے۔

میں تمھارے تعاقب میں دوڑ گئی۔۔

آڈیٹوریم سے باہر بل کھائی سرمئی پتلی سڑک پھوٹ پھوٹ کے روئی۔۔کبھی اس کے سینے پر میں نے خوشبو سے ہواؤں پر تمھارا نام لکھا تھا۔سامنے گول باغیچے کے وسط میں چھتری نما سایہ دار گل مہر اپنے پھولوں کی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں میں امڈ آئے آنسوؤں کو چپکے سے پی گیا۔اس کے سرخ پھولوں کی مہک تمھارے وجود کے گرد بندھ کر تمھارے ساتھ جا چکی تھی۔۔گل مہر صرف رنگ کا کیا کرے گا؟؟

کتنی منت سماجت کی تھی میں نے ان پھولوں سے، اس دھان پان سی سڑک سے۔۔کہ اب بس بھی کرو۔تب کہیں بارش کے پہلے جھونکے نے ان کے چہرے پر آئی اداسی کا سبب پوچھا تھا اور مجھے پہلی بار شدت سے اندازہ ہوا کہ چاہت کے وجود کا بے نام احساس کتنا طاقتور جذبہ ہے جس سے زندگی کا ہر لمحہ ہواؤں کے دوش پر اتراتا ہوا بہنے لگتا ہے۔ہر سو، ہر سمت، ہر حسن و بدصورتی میں، ہر چہرے میں۔وہی عکس، وہی مانوس خوشبو حل ہوجاتی ہے۔

لائبریری کے شیلف، تمھاری مخصوص کرسی اور تمھاری چھوئی ہوئی اردو ادب کی کتابیں اور میری جھولی۔۔تمھاری مہک کے لافانی احساس کو سمیٹے اپنے وجود پر رشک کرتے رہے۔

میں نے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر لیا۔چاہت کے طاقتور جذبے کے نام پر تمھارے بغیر لمحوں کے پتھریلے ناہموار راستے کاٹنے کا سلسلہ بڑے حوصلے کے ساتھ جاری تھا۔۔کہ ایک موڑ پر مجھے ایک زوردار ٹھوکر لگی۔۔

عاطف! ہمارا بیچ میٹ۔لمبے قد اور لمبی گاڑی والا!!! وہ بے دھڑک آیا اور مجھے بیاہ لے گیا۔پہلے سے بھی طویل گاڑی میں۔۔ایک نہ ختم ہونے والے سفر پر۔

پہلی رات۔۔۔۔میں تیز رفتار پانی کے بہاؤ میں اپنی ہستی کھوتا جزیرہ۔۔ایک طرف پانی کی کاٹ اور دوسری سمت ریت کا ساحل۔۔عاطف کا خوبصورت کسرتی جسم جاڑے کی چاندنی رات میں اپنے سر کو اٹھائے سرد ریت کے ٹیلے میں تبدیل ہوگیا۔نہ مہک، نہ احساس، نہ زندگی!!! اور میں۔۔۔میں ریت کے ٹیلے پر بلندی سے پستی اور پھر پستی سے بلندی کی طرف برہنہ پا دوڑتی رہی یہاں تک کہ میرے پاؤں اس ٹھٹھرتی ٹھنڈ سے پڑے آبلوں سے بھر گئے۔۔میرا جسم اس ٹھنڈ سے اکڑ کر ڈھیر ہوگیا۔ریت کے سرد ذرے میری آنکھوں کو جلانے لگے۔۔میں نے کس کے آنکھیں بند کر لیں۔۔کہ اچانک تمھارے ماتھے پر اگ آئے صبح تازہ دم سورج کی تمازت سے نیم گرم آبدار موتیوں نے میری آنکھوں میں سنہری رنگ بھر دیئے۔۔۔ان ننھے منے قوس قزح بکھیرتے موتیوں سے قطرہ قطرہ آب حیات نچوڑ کر میں۔۔چاندنی رات کے دامن میں اٹھ آئے سرد ریت کے ٹیلے پر سے آبلہ پا گزر آئی۔

اور آج بھی ہر رات۔۔صبح تک۔۔۔میں اپنے اکڑے ہوئے جسم کا ساتھ چھوڑ کر۔۔ان نیم گرم موتیوں کی حرارت سے اپنی رات۔۔۔۔اور ان کی جھلملاہٹ سے اپنی ہر صبح روشن کرتی ہوں!

عاطف کی عطا کردہ زندگی میرے لیے ہر طرح کی آسائش سے لبالب بھری ہے۔وہ کتنے بڑے نام اور بڑے دام والے پرفیوم ڈھونڈھ کر لاتے ہیں لیکن۔۔۔مجھے ہر طرح کی خوشبو سے الرجی ہے۔۔

میرے موبائیل فون کی رنگ ٹون بج اٹھی۔۔۔

''یس ڈاکٹر رعنا ہیر''

''ڈاکٹر جلدی آجائے ایمرجنسی ہے۔''

اف!۔رات کے دو بجے!۔۔میں نے جلدی سے ڈرائیور کو فون کیا۔۔دس منٹ میں تیار تھی میں۔۔ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکا کر عاطف کے کان کے پاس جھک کر کہا۔

''عاطف! میں ہاسپٹل جا رہی ہوں۔'' منہ کمبل سے باہر نکالے بغیر ہی مرے ہوئے سانپ کی طرح ٹھنڈی کلائی عاطف نے میری گردن میں لپیٹ دی۔۔ اور کمبل میں ہی ہوائی کس اچھال دیا۔

آٹومیٹک لاک والا ہینڈل کھینچ کر میں نے دروازہ بند کیا اور باہر کھڑی نیلی بی ایم ڈبلیو کار میں بیٹھ گئی۔

بھاری سر کو سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔۔کار کے بند شیشوں کے باہر سڑک پر زندگی بہہ سی پڑی ہے۔۔

نصف شب گذرنے پر بھی۔۔ سڑک پر گاڑیاں تازہ دم دوڑ رہی ہیں۔کسلمندی کا کوئی شبہ تک نہیں۔۔ٹریفک سے بھرے اوور برجز کا سلسلہ اور کاروں کے صاف ستھرے شیشوں سے جھانکتے صحت مند اور اکثر خوبصورت چہرے۔۔صفائی والی گاڑیاں بجلی لے لے کر سڑکوں سے برائے نام کوڑا سمیٹ رہی ہیں۔ اور برج کے نیچے لگی مرکری چوکور لائیٹس کی قطار میں۔۔زندگی سے لبریز پل پل میں رنگ بدلتے فوارے دھیمے سروں میں گنگنا رہے ہیں۔

اودے سفید گلابی پھولوں سے ڈھکے گول چوراہے۔۔۔مجھے کبھی انسیت نہ محسوس ہوئی اس پر شباب ریگزار سے۔مگر آج نہ جانے کیوں؟؟ کچھ مانوس چہل پہل ہے۔

بند ریسٹورنٹ پر لگے سائین بورڈ کی جلتی بجھتی روشنیوں کی لہروں میں بڑے بڑے مصنوعی پھلوں سے ٹپکتا خوش رنگ رس، الیکٹرک تندور کی نارنجی لپٹوں میں بھنتا شاورما۔۔۔مجھے پہلی بار کھل کے بھوک لگی۔اتنی بیش بہا نعمتوں کو پا کر آج میرا دل تشکر سے بھر گیا۔۔ڈرائیور نے تیزی سے بریک لگائے۔۔ٹریفک لائٹ سرخ ہوگئی تھی ۔۔

"دھن۔۔ دھنا دھن،۔۔دھن دھنا دھن" دف کی دھمک سے ایک سریلا شور فضا میں تیر گیا۔ٹریفک رکنے پر سعودی نوجوانوں نے اپنی گاڑیاں روک دیں۔۔کوئی فٹبال ٹیم جیت گئی ہے۔

میں نے ہاسپٹل کا نمبر ڈائیل کیا۔سوچا کہ ایمرجنسی کی نوعیت معلوم کرنا بہتر ہے۔کیرالائیٹ نرس نے اپنی آدھی انگلش اور آدھی ملیالم اور بچی کھچی ہندی میں جو مجھے سمجھایا تو اس کا مطلب یہی نکلا کہ مکہ مکرمہ جاتے ہوئے ایک منی بس ٹریلر کی زد میں آ کر حادثے کا شکار ہوگئی ہے۔کافی زخمی ہیں اور کچھ اموات بھی ہو چکی ہیں۔اوہ!۔بڑا جان گسل کام ہے۔ٹکڑوں میں بٹے مردہ جسم، سسکتے تڑپتے کراہتے زندہ چہرے۔۔مگر۔۔۔دل یہ ہولناک حادثہ کی خبر سن کر بھی کھلا سا ہی رہا۔۔شاید میں عادی ہوگئی ہوں۔ اپنے پیشے سے مانوس۔گہرے کالے رنگ کے سوڈانی گارڈ نے مسکراتی پیلی آنکھوں سے سیلوٹ کرتے ہوئے ایمرجنسی وارڈ کا دروازہ کھولا۔وارڈ میں ایک طرح کا جانا پہچانا سکوت۔۔۔آہٹیں۔۔۔سرگوشیاں۔۔۔۔اسٹریچر کے پہیوں کی مانوس کھڑ کھڑاہٹ کا ملا جلا ہنگامہ میرا منتظر تھا۔

کاروں کے کھلے دروازوں اور کھڑکیوں میں سے ہاتھ ہلا کر ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔کچھ منچلے سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے رخسار سے رخسار مس کر کے ہونٹوں سے بوسے کی صدا بلند کرنے لگے۔مجھے یہ دف کی دھمک پسند آئی۔اور ان نوجوانوں کی بے فکر ادائیں دل کو بھا گئیں۔۔

سعودی پولس اہلکار اپنی نازک کمر اور نرم لہجے کے ساتھ ٹریفک میں رکاوٹ نہ ڈالنے کے لیے نوجوانوں کو سمجھا رہے ہیں۔تھکان کا احساس خوشی کے ان تمام ہلکے پھلکے رنگوں میں کہیں بھیگ گیا۔۔

لائٹ سبز ہوئی۔۔گاڑی آگے بڑھ گئی۔۔

میں نے سر پر سفید ٹوپی ہاتھوں میں ربر کے دستانے اور منہ پر سفید پٹی باندھ لی۔چھت میں لگی لائٹ کی بند آنکھیں ماحول کو سوگوار بنا رہی ہیں۔وارڈ بوائز اور نرسیں زخمیوں کی شناخت اور مرہم پٹی میں تندہی اور مکمل بے دلی سے جٹے تھے۔وحشت بالکل نہ تھی ان کے سپاٹ چہروں پر۔

کئی گھنٹے۔۔۔ان نیم مردہ اجسام میں زندگی کی حرارت کی ہلکی سی تلاش کی جی توڑ کوشش کرتی رہی میں۔

آٹھ اسٹریچر ایمرجنسی وارڈ کے خودکار دروازے سے نکل چکے تھے۔جن میں سے تین مردہ جسم تمام تر کاغذی کارروائی تک سردخانے میں جمنے کے لیے عمدہ پیکنگ میں بند کر دیے گئے۔۔۔اور پانچ زندہ یا زندہ

درگور۔اپنی بے بسی کے ساتھ ہاسپٹل کے وارڈوں میں منتقل کیے جانے کے لیے اپنے اپنے راستوں پر مڑ گئے۔خاموش دیوار پر گھڑی کی رینگتی سوئیاں دن کے گیارہ بجا رہی ہیں۔

میں نے ناک سے کپڑا اتارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو نرس کی بے رنگ آنکھوں سے سناٹا نکل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔۔ نرس نے انگلی دکھا کر بتایا۔۔ ایک مریض اور۔میرے ہاتھ رک گئے۔۔دروازہ اپنی مخصوص بے آواز آہٹ کے ساتھ کھلا۔۔

**’میں خودکار مشین کی طرح دروازے کی طرف تقریباً دوڑ گئی۔اسٹریچر سے وارڈ بوائے کے ہاتھ الگ گئے۔۔اور اسٹریچر کے اسٹیل ہینڈل مضبوطی سے پکڑ لیے۔ایک ایک قدم گن کر میں نے چلنا شروع کیا۔اس سے دھیمے میں چل نہیں سکتی تھی۔مگر۔۔راستہ پورا ہو گیا۔‘**

وارڈ بوائے نے مرے مرے قدموں سے اسٹریچر کو دھکیلا۔

دروازہ بند ہو گیا۔۔

میں خودکار مشین کی طرح دروازے کی طرف تقریباً دوڑ گئی۔

اسٹریچر سے وارڈ بوائے کے ہاتھ الگ کئے۔اور اسٹریچر کے اسٹیل ہینڈل مضبوطی سے پکڑ لیے۔ایک ایک قدم گن کر میں نے چلنا شروع کیا۔اس سے دھیمے میں چل نہیں سکتی تھی۔مگر۔۔راستہ پورا ہو گیا۔۔

اسٹریچر سامنے رکھ کر میں اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے ناک پر سے کپڑے کی پٹی کو ہٹا لیا۔۔دستانے اتار لیے۔۔

گھڑی کی سوئیاں سوگواری کے دامن کو چھوڑ کر حیران ہو کر میری طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئیں۔

بے حد ملائمت سے میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے سر پر ڈھکی سفید چادر کو ہٹایا۔ نرس کی کپاسی آنکھیں سناٹے سے باہر نکل پڑیں۔چھت میں لگی روشنی کی ننھی منی آنکھیں رنگ برنگے قمقموں کے جھپاکے بکھیرنے لگیں۔۔

آڈیٹوریم کا مائک لہک اٹھا۔۔’’یہ رات۔۔یہ چاندنی پھر کہاں۔۔۔سن جا دل کی داستاں۔۔۔‘‘اس کے بکھرے کالے گھنے بالوں کی تہہ میں شفق اپنی رنگت چھوڑ گئی۔۔اپنی آسمانی ساڑی کے پلو میں بکھری ہوئی شفق کی لالی کو آہستگی سے چن چن کر۔۔سمیٹ کر اپنے دھڑکتے سینے پر سونے کے بیش قیمت تمغوں کی طرح سجا لیا۔

آڈیٹوریم کا مائک رک رک کر گانے لگا۔۔’پیڑوں کی شاخوں پہ سوئی سوئی چاندنی۔۔۔تیرے خیالوں میں مہکی مہکی چاندنی۔۔۔اور تھوڑی دیر میں تھک کے لوٹ جائے گی۔۔‘

نرس کی کپاسی آنکھیں زندگی کی حرارت سے سنہری ہو گئیں۔ افریقن گارڈ کا سپاٹ چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو اٹھا۔۔بند دکانوں کے سائین بورڈ پر بنے پھلوں سے میٹھا تازہ رس ٹپکنے لگا۔۔چوراہے پر سعودی نوجوان دف کی زندہ دھمک پر ایک دوسرے کو شوخی سے اپنے قریب کر کے بوس و کنار کے سرور میں بہکنے لگے۔۔

’’رات یہ بہار کی پھر کبھی نہ آئے گی دو ایک پل اور ہے یہ سماں۔۔‘‘۔گھنی کماندار بھوؤں کے ذرا سا اور۔۔اوپر اس کے فراخ۔۔ذہین ماتھے کے عین بیچوں بیچ ابھرے نیم گرم ننھے آب دار سچے موتی ابھر آئے۔۔اور ان ننھے منے آب دار سچے موتیوں کی حرارت کو۔۔میں نے جھپک کر اپنی پلکوں میں محفوظ کر لیا۔۔اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں!!!

سڑکوں پر اگائے گئے سفید اودے گلابی مصنوعی پھول ایک دم دیسی ہندوستانی گلابوں کی مہک دینے لگے۔۔۔سونا ریگزار ایک مہکتا گلزار بن گیا۔۔

’’یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں۔۔سن جا دل کی داستاں۔۔سن جا دل کی داستاں۔۔‘‘میں نے۔پوری قوت سے۔صدیوں سے بھٹکتی بالکل پیاسی روح میں اس لافانی مہک کو اتار لیا۔۔۔ پوری قوت لگا کر میں نے سانسیں کھینچ لیں۔۔۔میرے پھیپھڑے پھٹنے لگے۔۔

اس کی بند پلکوں میں سے ابھری ہوئی سرخ ڈوروں والی زندہ آنکھیں کھل نہ جائیں۔۔میں نے شرما کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔اسے آخری بار دیکھے بغیر۔۔۔۔اور سانس روکے روکے۔۔۔

سفید چادر کو احتیاط سے اس کے چہرے پر ڈھانپ کر ٹیپ لگا دیا۔۔۔

□□□

**Rakhshanda Roohi Mehdi**

115 - A , Pocket - A

DDA Flats

Sukhdev Vihar

NEW DELHI- 110025

مینا خان

# مجبوری

آج کچھ زیادہ ہی گرمی تھی، میں جیسے ہی چیمبر میں پہنچی اے۔سی کی ٹھنڈک کا احساس ہوا اور میں نے وہاں ایک شخص جن کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی، کو وہاں اپنا منتظر پایا۔ سلام دعا کے بعد مدعے کی بات پر آگئے۔ان کی لڑکی فوزیہ کی شادی تقریباً دو سال پہلے ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی تھی۔اس وقت انھوں نے لڑکی کی خوبصورتی دیکھ کر اسے پسند کر لیا تھا اور بغیر کسی جہیز کے اُسے خوشی خوشی رخصت کرا کر لے گئے تھے۔لیکن اب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ لڑکی کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔غریب گھر میں رشتہ داری ہونے پر اُنھیں شرمندگی ہوتی ہے اور بقول نازیہ کہ ''ہماری بھی بیٹی کی سسرال میں کوئی عزت نہیں ہے ہم بھی بڑے لوگوں میں بیٹی دے کر پچھتا رہے ہیں اسی لیے چھٹکارا چاہتے ہیں کوئی ایسی ترکیب بتایئے جو آسانی سے اور جلد سے جلد یہ کام ہو جائے۔''

''یعنی آپ لوگ طلاق چاہتے ہیں، آپ کی بیٹی کیا نام ہے ان کا..؟''میں نے جانکاری طلب کی۔

''جی فوزیہ نام ہے،''محترمہ نازیہ نے فوراً جواب دیا۔

''اوکے.....فوزیہ کیا چاہتی ہے.....؟ آپ اُنھیں ساتھ لے کر نہیں آئے...؟''

''اجی اُس نے کیا چاہنا ہے، بچی ہے''سعید الحسن نے بڑا سمجھدار بنتے ہوئے جواب دیا۔

''دیکھئے جو بھی کارروائی ہوگی وہ فوزیہ کی طرف سے ہوگی اس لیے میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے،''میں نے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے وکیل صاحبہ...آپ اُسے سمجھا دیجئے گا، طلاق کے لیے عدالت میں کیا کیا کہنا ہے۔''نازیہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے''میں نے بات ختم کی تو وہ دونوں جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ میرے قریب آکر آہستہ سے بولی، ''میڈم ہم بیحد غریب آدمی ہیں، ان کی معمولی تنخواہ میں گزارہ بھی مشکل سے ہوتا ہے۔آپ لڑکے والوں سے جو بھی پیسہ دلائیں گی ہم اس میں سے آپ کی فیس دیں گے...اور جتنا زیادہ پیسہ آپ دلائیں گی آپ کو فیس بھی اتنی ہی زیادہ ملے گی۔'' اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

مجھے کچھ حیرت سی ہوئی....

''لیکن پیسے کی بات کہاں سے آگئی''میں نے الٹا سوال کیا۔

''کیوں میڈم کیا ہم فری میں طلاق دیں گے۔ ہماری لڑکی دو سال وہاں رہی ہے ہم اسے ایسے ہی تھوڑے چھوڑ دیں گے۔''وہ مجھے سمجھا رہی تھی...اب اس کی آنکھوں سے چمک غائب ہو چکی تھی، غالباً وہ مجھ سے حامی بھروانا چاہتی تھی۔

''دیکھیے طلاق تو آپ لوگ چاہتے ہیں اور آپ نے خود ہی بتایا کہ شادی بغیر کسی لین دین کے ہوئی تھی پھر بھی فوزیہ کو اس کا حق مہر اور عدت کا خرچہ مل سکتا ہے لیکن وہ تو فوزیہ کا ہوگا''میں نے وضاحت کی۔

''نہیں میڈم ایسی بات نہیں ہے آپ تو سب جانتی ہیں، لڑکی کو تو غریب آدمی بھی کئی لاکھ روپیہ دیتا ہے۔ وہ تو بڑے رئیس ہیں، گاڑیاں، کوٹھی، سب کچھ ہے، گھر میں بھی نوکر کام کرتے ہیں۔آپ ٹھیک سے لکھت پڑھت کرنا خوب موٹی رقم دلانا، آپ کا بھی فائدہ ہوگا اور ہم غریبوں کا بھی بھلا ہو جائے گا۔''

اب مجھے ان کی سائکلوجی سمجھ میں آرہی تھی۔ سعید الحسن خاموشی سے ہماری بات سن رہے تھے، وہ مجھے کسی سوچ میں گم نظر آئے۔ وہ لوگ جلد ہی فوزیہ کو لے کر آنے کا کہہ کر رخصت ہوئے اور دو تین دن بعد سعید الحسن اپنی بیوی نازیہ اور بیٹی فوزیہ کو لے کر میرے آفس میں حاضر تھے۔ فوزیہ غضب کی خوبصورت لڑکی تھی گوری لمبی، نازک سی لڑکی جسے قدرت نے واقعی فرصت سے بنایا تھا۔ وہ بیحد اداس تھی اس کی شربتی

آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

''وکیل صاحبہ یہ فوزیہ ہے ہماری بچی، دیکھ رہی ہیں کیا حالت بنا دی ہے ظالموں نے۔'' نازیہ نے ہمدردی جتائی۔

فوزیہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے غور کیا فوزیہ اپنے ابو پر گئی ہے وہ کسی طرح بھی نازیہ کی بیٹی نہیں لگتی تھی لیکن مجھے ان کے ذاتی معاملات سے کیا... میں نے اپنی سوچ کو جھٹک دیا، میں نے فوزیہ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن جواب زیادہ تر نازیہ ہی دے رہی تھی۔ کافی دیر بات کرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو میں نے سیدھا فوزیہ سے سوال کیا۔

''فوزیہ...... کیا تم واقعی طلاق چاہتی ہو...؟''

''جی....'' وہ بدستور سر جھکائے ہوئے تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ جیسا میرے والدین چاہیں، وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

میری چھٹی حس احساس دلا رہی تھی کہ معاملہ ویسا نہیں ہے جیسا بتایا جا رہا ہے۔ نازیہ اور سعید دونوں بار بار طلاق کا دعویٰ کر رہے تھے اور جلد کارروائی پر زور ڈال رہے تھے۔ بہرحال مجھے اپنا کام کرنا تھا۔ انھوں نے بطور فیس کچھ روپیہ جمع کیا اور باقی بعد میں دینے کا وعدہ کیا تو میں نے ان کا استغاثہ تیار کر دیا لیکن میں مطمئن نہیں تھی میں جلد سے جلد ساری سچائی جان لینا چاہتی تھی لیکن اس کے ماں باپ کوئی موقع فراہم ہی نہیں ہونے دے رہے تھے۔ عدالت میں دعویٰ پیش ہوا تو عدالت نے فوزیہ کے شوہر فراز احمد کے نام سے نوٹس جاری کر دیا اور واسطے سمن تاریخ مقرر کر دی۔

عدالت سے آتے وقت موقع غنیمت دیکھ کر میں نے فوزیہ کو اپنا ویزٹنگ کارڈ تھما دیا اور کہا کہ ''جب چاہے مجھ سے رابطہ قائم کر سکتی ہے۔''

فوزیہ نے جلدی سے وہ کارڈ لے کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اس کے جانے کے بعد کئی دن تک مجھے لاشعوری طور پر فوزیہ کی کال کا انتظار رہا لیکن اس کا کوئی فون نہیں آیا، کیس کی تاریخ میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔

ایک دن چھٹی تھی میں اپنے ہی گھر پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی تبھی ندیم بھائی کا فون آیا۔ ندیم میرے چچا زاد تھے، انھوں نے بتایا ان کے ایک دوست کا مسئلہ ہے وہ شام کا اپائنٹمنٹ چاہتے ہیں حسب معمول میں نے انھیں شام چھ بجے کا وقت دے دیا۔ ندیم بھائی کے ساتھ آنے والا شخص اتفاق سے فوزیہ کا شوہر فراز احمد تھا۔ فراز احمد نے بتایا کہ ''یہ ان کی محبت کی شادی تھی پہلے تو اسٹیٹس اور تعلیم کا فرق ہونے کی وجہ سے گھر والے تیار نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں شادی کے لیے منایا گیا۔ شادی بھی ہو گئی لیکن اس لڑکی کی سوتیلی ماں اسے وہاں رہنے نہیں دیتی۔ بہانے بہانے سے اس کو گھر بلا لیتی ہے وہ اس کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کی سوتیلی ماں کسی طرح خوش نہیں ہوتی۔ سسر صاحب بیوی کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں کرتے۔ اب ایک ماہ سے ان کی بیوی مائکے میں ہے وہ ملنے گئے تو انھیں ملنے نہیں دیا گیا۔ وہ کہتے ہیں تم ہماری لڑکی کو طلاق دے دو ہم اسے تمھارے گھر نہیں بھیجنا چاہتے۔ جبکہ مجھے اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہیں ہے میں ہر حال میں فوزیہ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے فراز احمد سے وعدہ کیا کہ ''میں فوزیہ کو آپ کے ساتھ بھجوانے کی پوری کوشش کروں گی۔''

وقت گزرا اور وہ تاریخ بھی آ گئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ میرے عدالت پہنچنے سے پہلے سعید الحسن اور ان کی بیوی نازیہ، اور فوزیہ اور ایک سانولی سی لڑکی جس کی شکل نازیہ سے ملتی تھی میرے آفس میں موجود تھے۔

حسب معمول سعید الحسن صاحب خاموش تھے، نازیہ ہی بول رہی تھی۔

''میڈم آج تو فوزیہ کے سسرال والے آئیں گے آپ بھی ان سے بات کر لینا لڑکی تو ہمیں بھیجنا نہیں ہے لین دین کی بات کر لیں اور معاملے کو نپٹا لیں بس۔ وہ اپنے گھر اور ہم اپنے گھر۔''

دیکھیے ہو سکتا ہے ان کے رشتے میں کچھ گنجائش ہو۔ ہم ان کے رشتے کو توڑنے کی نہیں جوڑنے کی کوشش کریں گے۔ دونوں طرف کے وکیل اور عدالت ان دونوں کو سمجھائیں گے۔

''نہیں میڈم کچھ نہیں بدلے گا۔ ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے، ہماری اور بھی لڑکیاں ہیں کوئی بیٹا تو ہے نہیں۔ ہم کہاں تک ان کی برابری کریں گے۔ ہم ٹھہرے غریب آدمی جتنی جلدی معاملہ نپٹ جائے اتنا اچھا ہے۔ کیوں جی... کہتے کیوں نہیں،'' وہ اپنے شوہر سے مخاطب تھی۔

''جی... جی صحیح ہے'' وہ کافی پریشان لگ رہے تھے، چلیے عدالت میں چلتے ہیں۔

''میڈم جی ساری باتیں یہیں طے کر لیتے ہیں، آپ کو کیا امید ہے کتنا پیسہ دے سکتا ہے فراز،'' وہ مدعے پر آ گئی۔

آپ بتائیے کتنا پیسہ چاہتی ہیں آپ،'' میں نے اسے تولنا چاہا۔

''ابھی ہمارے محلے میں سات آٹھ مہینے پہلے فیصلہ ہوا، لڑکی کو سات لاکھ روپے ملے جبکہ لڑکا مکینک ہے اور یہ تو بڑے بزنس مین ہیں، ان کے لیے تو بیس لاکھ بھی کم نہیں۔'' وہ بولتی جا رہی تھی اور میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مجھے طلاق کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی، میں نے خود کو نارمل کیا۔

''سات لاکھ تو بہت ہوتے ہیں، کسی نے غلط بتایا آپ کو'' میں نے کہا۔

’’نہیں میڈم...ان کے حالات تو ہم سے بھی زیادہ خراب تھے، فیصلہ ہوتے ہی ان کی زندگی بدل گئی۔ پورا گھر نیا کرالیا اور بیٹھک بھی بن گئی، نیا فرنیچر آ گیا۔لڑکی کے بھائی نے کرانا کی دکان کھول لی اور چھوٹی بہن کی شادی بھی دھوم دھام سے کی۔ اب کیا سات لاکھ بھی خرچ نہیں ہوئے ہوں گے ان سب میں۔‘‘

’’اور اس لڑکی کا کیا ہوا؟‘‘ میں نے پوچھ ہی لیا۔

’’وہ جی.... چھ مہینہ بھی نہیں لگے۔ ماموں کے لڑکے سے نکاح ہو گیا، اتفاق سے اس کی بیوی مرگئی تھی۔ بچے تینوں چھوٹے تھے خوشی سے بیاہ کر لے گئے، کوئی مسئلہ نہیں ہے سب خوش ہیں‘‘۔ وہ پھر یہ کہنے سے بھی نہیں چوکی ماشاء اللہ ہماری فوزیہ تو پریوں جیسی ہے اس کے لیے رشتوں کی کیا کمی، وہ فوزیہ اور ان کے ابو کے جذبات سے بے خبر بولے جارہی تھی اور سنہرے خوابوں کی تعبیر میں مصروف تھی۔

’’تو صرف پیسوں کے لیے آپ فوزیہ کا گھر برباد کرنا چاہتی ہیں‘‘ میرے لیے غصے کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

’’اب میڈم جی آپ کو کیا پتہ۔ مفلس آدمی کی زندگی کیسے گزرتی ہے، دو جوان بیٹیاں گھر میں موجود ہوں تو ماں باپ کی آنکھوں سے نیند اُڑ جاتی ہے اگر لڑکیاں خوبصورت نہ ہوں تو بھاری جہیز کے بغیر ان کی شادی کرنا آج کے زمانے میں تو ناممکن ہے جو بھی رشتہ لے کر آتے ہیں پورے گھر کے سامان پر یوں نظریں گھماتے ہیں جیسے وہ لڑکی دیکھنے نہیں ہماری حیثیت کی ناپ تول کرنے آئے ہوں۔‘‘ وہ پہلی بار بیحد غمزدہ دکھائی دی۔ اب تک مجھے اس عورت پر غصہ آ رہا تھا اچانک مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

’’کیا فوزیہ تمھاری سگی اولاد نہیں؟‘‘ میں نے پوچھا تو وہ رو پڑی۔

’’ایسا نہ کہیں میڈم ...فوزیہ میری مرحومہ دوست رقیہ کی بیٹی ہے۔ فوزیہ کی پیدائش کے چھ مہینے بعد ہی رقیہ کا انتقال ہو گیا، ہم دونوں میں بیحد محبت تھی رقیہ نے اپنی بیٹی کا نام میرے ہی نام سے ملا کر رکھا تھا۔ رقیہ نے انتقال کے وقت فوزیہ کو میری گود میں دے دیا تھا اور حسن صاحب سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مجھ سے ہی شادی کریں گے۔ رقیہ بیحد حسین تھی فوزیہ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ بدقسمتی سے میری بیٹی مجھ پر چلی گئی، فوزیہ نے میری بہت خدمت کی ہے۔ وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے مگر مجبوری انسان سے جو نہ کروائے وہ بہتر ہے۔‘‘ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ میری آنکھیں بھی بھیگنے لگی تھیں، پھر انھیں ساتھ لے کر عدالت پہنچ گئی۔ اب سارا معاملہ آئینہ کی طرح صاف ہو چکا تھا۔ عدالت کے باہر مجھے فراز احمد کھڑے دکھائی دیے ان کی نظر فوزیہ پر پڑی لیکن فوزیہ سر جھکائے کھڑی تھی کسی مجرم کی طرح۔ میں نے فراز کو الگ بلایا اور پوچھا...

’’آپ اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتے ہیں۔‘‘ وہ میرے سوال پر خاموش رہا۔

’’اگر اسے ساتھ لے جانا ہو تو کتنی قیمت دے سکتے ہیں۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں‘‘ وہ واقعی الجھ رہا تھا۔ میں نے اس کے نزدیک جا کر آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا۔

’’کوئی مسئلہ نہیں...بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہو گیا۔‘‘ میری بات سن کر وہ مسکرا دیا۔

’’ٹھیک ہے پھر میرے آفس میں چلیے۔‘‘ میں نے اس کو وہاں سے روانہ کیا۔

’’اوکے...‘‘ کہہ کر وہ موبائل آن کرتا ہوا چلا گیا، میں اپنی مؤکل کی طرف واپس آئی اور نازیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ’’ایک ہی پیشی میں آپ کا فیصلہ ہو گیا ہے وہ پچیس لاکھ دینے کو تیار ہے‘‘ میں نے پچیس لاکھ پر زور دے کر کہا۔

’’اچھا...واقعی‘‘ نازیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔‘‘

’’ہاں لیکن اس کی ایک شرط ہے۔‘‘

’’شرط کیا‘‘ سعید الحسن صاحب پوچھ رہے تھے۔ فوزیہ اور اس کی بہن اور نازیہ اداس کھڑی تھیں۔

’’ان کی شرط یہ ہے کہ وہ آج ہی روپیہ دے کر فوزیہ کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔‘‘

’’کیا مطلب....!!‘‘ نازیہ میرا منہ دیکھ رہی تھی۔

’’ہاں...وہ روپیہ فوزیہ کو ساتھ لے جانے کا دے رہے ہیں چھوڑنے کا نہیں۔‘‘ میں نے دیکھا کہ فوزیہ کس طرح خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کھڑی تھی اور تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میں نازیہ جیسی ماؤں کی مجبوری اور اس کے حل کرنے کی تجویز پر غور کر رہی تھی جہیز جیسی لعنت سے چھٹکارے کے لیے صرف قانون بنا دینا ہی کافی نہیں ہے ہمیں اپنی سوچ کے زاویوں کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے سوچتے ہوئے میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

□□□

**Meena Khan**
House No. 29, Green Wood Society
Sector Omega-1, Greater Noida
District Gautam Budh Nagar-201308 (U.P)

# کنگن

ڈاکٹر مسرور صغریٰ

اس عسرت خانۂ تکمیل میں خواب در خواب چیختے صحرا کا سکوت اس طرح طاری تھا گویا کہیں ایسی ناگہانی آفت آنے والی ہو جس سے دل لرز لرز جائے اور سانسیں تھم تھم جائیں جیسے وقت کے ظلم کی ایڑیوں کے نشان رفتہ رفتہ سینوں میں ورم پیدا کر رہے ہوں اور ساری فضا گویا تلوار بن کر ہر جذبات واحساسات کو تیزی سے کاٹے دے رہی ہو اور ظالم اوقات کے اس وطیرے سے سابقہ پڑا ہو کہ وہ اسے ہر خوشیوں سے محروم کر کے قسمت پہ فقط محرومی لکھ کر ہر خوشی اپنے نام مخصوص کر لینا چاہتا ہو۔۔قدرت کی یہ ستم کاریاں آخر کس رخ اسے لے جائیں گی۔وہ تنہا ویران لمحوں میں گم صم کھڑی یہی سوچ رہی تھی خدایا یہ کیسی غم کی آندھی ہے جس نے ایک ہی جھونکے میں سب کچھ تہس نہس کر دیا ہے چاروں جانب سے واویلا کی صدائیں آ رہی ہیں ہر کوئی گریہ کناں ہے آہ یہ کیسا درد ہے کیسا غم ہے کون ہے اس غم کا محور، کون ہے پرسہ لینے والا کس کی دنیا آباد ہونے سے پہلے اجڑ گئی۔۔اللہ یہ غم کس قدر جان لیوا ہے جو زندگی کے ہر خوشنما رنگ کو بے رنگ کیے دے رہا ہے اور وہ بھی اس عالم شباب میں جب کلیاں چٹختی ہیں تو سانسیں تیز چلنے لگتی ہیں جب باد صبا ہولے ہولے کانوں کے قریب سے گزرتی ہے تو ایسا لگتا ہے کسی کا پیغام لے کر آئی ہو کچھ کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہوں اور اس کی تپش سے سارا وجود گویا جلنے لگا ہو شبنم کے قطرے گویا ارمانوں کے پھولوں پہ گرے ہوئے عطر محسوس ہوتے ہیں جو دلی کیفیات و آنکھوں کے رنگ و نور کو شہابی بناتے ہیں مدہوش کر دیتے ہیں پھیلی ہوئی ڈالیاں گویا محبوب کی باہیں ہوں جو گنگنا کر اپنی سمت دعوت وصل دے رہی ہوں ساری دنیا اپنی جمالیات کے ہمراہ کس قدر خوبصورت اور دلنشیں لگتی ہے یارب! اس عالم جوانی میں یہ کون لٹ گیا یارب یہ کس کے بین ہیں یہ کیسی آوازیں ہیں جو میرا کلیجہ چیرتی جا رہی ہیں پروردگار سفا کی تو تیری فطرت میں نہیں تو رحیم و کریم ہے پھر یہ رونے کی صدا کس کی ہے کہ آسمان و زمین متلاطم ہیں پروردگار کیوں ساری دنیا خاموش ہے کیوں مجھ سے کوئی نہیں بتاتا کہ آخر ماجرہ کیا ہے۔۔۔کچھ نہیں پتہ بس نوشابہ خالہ کے گھر میں صف عزا بچھی تھی اور سب سوگوار تھے۔۔۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں ان کے آنسوؤں نے انھیں کچھ کہنے نہیں دیا وہ بے تحاشہ رونے لگیں۔۔میری الجھنیں مزید بڑھ گئیں۔۔۔کوئی گویا مجھے کوڑے لگا رہا تھا اور میرے وجود سے گویا شعائیں نکل رہی تھیں میرے قدم شل ہوتے جا رہے تھے۔امی امی ہوا کیا ہے آخر کچھ تو بتایئے امی نے نشرہ کو سینے سے لگا لیا'' کیا بتاؤں میری بچی ہوا کیا ہے سب کچھ اجڑ گیا میری بچی تیری خالہ زاد

کا گھر اجڑ گیا تیری عذرا بجیا کا تیرے نوشے بھائی کی اچانک ہی موت ہو گئی ہے بیچاری عذرا نے تو ابھی کوئی خوشی دیکھی ہی نہیں اس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں چھوٹی اس کے سہاگ کے سارے جوڑے یوں ہی سلے رکھے ہیں انھیں کھولا بھی نہیں کسی نے ہائے میری بچی،، میری عذرا۔۔۔ پہاڑ سی زندگی اس کی کیسے گزرے گی دیکھو نہ کیسی بت بنی بیٹھی ہے بے چاری یہ بھی نہیں جانتی کہ کیا ہو گیا ہے اس پر کتنا بڑا ستم ٹوٹ گیا ہے ارے کوئی اسے رلائے نہیں تو مر جائے گی ننھی سی جان ارے کل ملا کر ڈیڑھ مہینے ہی تو ہوئے ہیں اس کے بیاہ کو خدارا کیسا ستم ہے یہ۔ کیا بگاڑا تھا میری پھول سی بچی نے تیرا مر جائے گی وہ اور وہ وہ ننھی سی جان جو اس کے شکم میں ہے اپنے باپ کا منہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہو گا اس نگوڑی کو ہائے اللہ کس گناہ کی سزا ملی پروردگار تو غفور والرحیم ہے بخش دے میری بچی کو مگر اب کیا جو ہونا تھا ہو گیا معبود کیا ستم ہوا ہائے مجھے کیوں نہ موت آ گئی اس کڑیل جوان کو موت آنے سے پہلے میں کس دن کے لیے زندہ رہ گئی پروردگار کس دن کے لیے ارے کوئی تو میری بچی کو رلائے۔۔۔"

نشرہ کے پیروں سے زمین نکل گئی تھی خدایا خدایا یہ کیا ہو گیا معبود یہ کیا ہو گیا کیسے سہیں گی عذرا بجیا یہ صدمہ کیسے برداشت کریں گی مگر ہوا کیا تھا کیسے کیا ہوا کیسے موت ہوئی نوشے بھائی کی یہ تو بتایئے۔۔۔ارے میری جان کیا بتاؤں۔۔ مجھ میں ابھی طاقت نہیں کچھ بتانے کی۔۔ نشرا نے مجمع میں موجود عورتوں کی باتوں کو غور سے سننا شروع کیا گرچہ اس کے کان کچھ بھی صحیح طریقے سے سننے کے قابل نہ تھے اسے کانوں میں بس سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی کوئی نہیں بتاتا کہ آخر ماجرہ کیا ہے۔۔۔۔۔بی بی۔ بی بی نشرہ یہاں آؤ، کیا ہوا کیوں اتنی بے چین ہو۔۔نوشابہ خالہ یہ کیا ہو رہا ہے یہ کیوں سب اس قدر رو رہے ہیں بتایئے ہمیں خدارا۔۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں ان کے آنسوؤں نے انھیں کچھ کہنے نہیں دیا وہ بے تحاشہ رونے لگیں۔۔ میری الجھنیں مزید بڑھ گئیں۔۔۔ میرے حواس پہ گویا کوڑے برس رہے تھے میرے قدموں میں چلنے کی طاقت نہیں تھی وہ اس طرح شل ہوتے جا رہے تھے۔۔امی امی ہوا کیا ہے آخر کچھ تو بتایئے۔۔۔ارے میری جان کیا بتاؤں۔۔ مجھ میں ابھی طاقت نہیں کچھ بتانے کی۔۔نشری نے مجمع میں موجود عورتوں کی باتوں کو غور سے سننا شروع کیا گرچہ اس کے کان کچھ بھی صحیح طریقے سے سننے کے قابل نہ تھے اسے کانوں میں بس سائیں سائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے کسی صحرا میں کہیں زور سے آندھیاں چل رہی ہوں اس نے سرگوشیوں پہ توجہ کی اللہ کیسی قیامت خیز باتیں ہیں نوشے بھائی کا ایکسیڈینٹ ہو گیا وہ ٹرین سے بجیا کو بچانے کی کوشش میں خود ٹرین کی زد میں آ گئے تمام رنگ آشوب فضائیں لہولہو ہو گئیں وہ بجیا کو لے کر کانپور گئے تھے ان کا پاسپورٹ بنوانے اور اسٹیشن آنے پر جبکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ ٹرین الہ آباد اسٹیشن پر رکتی نہیں انھوں نے اسی ٹرین کا انتخاب کیا اور ٹرین جب دھیمی ہوئی الہ آباد اسٹیشن پہ وہ انھیں صحیح سلامت ٹرین سے اتارنے کی کوشش میں خود ٹرین کی زد میں آ گئے۔۔۔ بجیا زخمی بے سدھ پڑی ہیں گرچہ انھیں ابھی تک نوشے بھائی کی موت کی خبر بھی نہیں ملی ہے ان کے پیروں کی انگلیاں شگافتہ ہو گئی ہیں کلائیوں پہ ورم ہے مگر بیبیاں یہ چاہتی ہیں کہ کسی بہانے سے ان کی چوڑیاں توڑ دی جائیں۔ جناب ایوبؑ کو صبر عطا کرنے والے ادھر بھی نظر کرم ایک سہاگن کا سہاگ اجڑ گیا ہے ایک معصوم نفس کا سہارا چھن گیا جس نے ابھی دنیا میں آ کر رونے کی ادا بھی نہیں سیکھی۔۔۔واقعی اللہ کی قدرت بھی بڑی نرالی ہے ایک سہارا چھینا تو دوسرے کا پہلے سے انتظام کر دیا۔

اے اللہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ تمام انس رکھنے والوں سے زیادہ مانوس ہے اور جو تجھ پر بھروسہ کرنے والے ہیں ان کی حاجت روائی کے لیے ہمہ وقت پیش پیش ہے۔ تو ان کی باطنی کیفیتوں کو دیکھتا اور ان کے چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا اور ان کی بصیرتوں کی رسائی سے باخبر ہے ان کے راز تیرے سامنے آشکارا اور ان کے دل تیرے سامنے فریادی ہیں اگر ان پر مصیبتیں پڑتی ہیں تو وہ تیرے دامن میں پناہ لینے کے لیے ملتجی ہوتے ہیں یہ جانتے ہوئے تمام باگ ڈور تیرے ہاتھ میں ہے اور ان کے نفاذ پذیر ہونے کی جگہیں تیرے ہی فیصلوں سے وابستہ ہیں۔ نشرہ میں قوت نہیں تھی کہ وہ چل کر عذرا کے پاس جاتی کیوں کہ اسے یقین تھا کہ اگر وہ ان کے پاس گئی تو اس کی کیا حالت ہو گی ممکن تھا شدت ضبط سے اس کا دم نکل جاتا۔۔ سارا ماحول سوگوار تھا اک ہنگامہ تھا گھر کے چاروں طرف واقعی زندگی کے تمام ہنگاموں میں سب سے بڑا موت کا ہنگامہ ہے اے خدا غم میں اتنی دیر پا تاثیر کیوں ہے خوشی کی بہ نسبت پالنے والے یہ موت حیات کا فلسفہ کیا ہے کیوں موت ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر فقط زندگی ہی زندگی ہوتی موت کا نام و نشان نہ ہوتا بڑا مشکل ہے اس غم سے ابھرنا اسے اپنے پاپا کی یاد آنے لگی اللہ ان کی موت کا ایک ایک منظر اس کی آنکھوں میں پھر گیا کس طرح اسے اپنے والد کی لاش سے جدا کیا گیا تھا کیوں یہ لاشیں گھر میں نہیں رکھی جا سکتیں کیوں مرنے کے بعد اس قدر عجلت میں لاش کو سپرد خاک کر دیا جاتا ہے کیا اس لیے کہ مرنے والا زندہ رہ جانے والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا یا پھر کوئی اور وجہ ہے کئی خیالات اس کے ذہن و دل کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے اسے ایسا لگ رہا تھا کہ زلزلہ آ رہا ہو قبل از قیامت

آ گئی ہو وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی عذرا کے پاس آئی اسے دیکھ کر ایسا لگا کہ اس میں کوئی چھل نہیں فریب نہیں کس قدر سادہ اور معصوم ہے یہ چہرہ یہ وجود ساری دنیا کے مکر و ریا سے مبری نا آشنا وہ خامشی سے بیٹھی رہی اور یہ سوچتی رہی تھی کہ کیسے بتاؤں کہ بجیا آپ کی آنکھیں جس کی محبت کے سرور سے خمار آلود ہیں جس کا وجود آپ کو اس عالم بے سروسامانی میں بھی تقویت پہنچائے ہوئے ہے جس کی دلنشیں گفتگو کے دلفریب آثار مثل گلال آپ کے رخسار پہ سایہ کیے ہوئے ہیں وہ کہیں معدوم ہو گئے ہیں بجیا آئیے میں آپ کو کلیجے سے لگا لوں اس طرح کہ آپ کی دھڑکنوں میں آیات شفا و سورہ یٰسین پڑھ کر دم کر دوں کہ آپ کو قرار آ جائے خدا میری آنکھوں کو ایسا فن دے دے کہ مجھے کچھ کہنا نہ پڑے اور بجیا سب سمجھ جائیں اس نے حسرت سے بجیا کی سمت دیکھا خالی آنکھیں کچھ سوال کرنے لگیں اس نے زور سے بجیا کو کلیجے سے لگا لیا بجیا بجیا کہتے کہتے وہ زار و قطار رونے لگی دونوں ہاتھوں کی چوڑیوں کو دیکھا اور انھیں چوم کر بس اک آہ بھر کر کہا ”بجیا یہ سہاگ کی چوڑیاں کاش تمھیں راس آ جاتیں۔۔۔ یہ شارب بھائی کے جاں بخش لہو کا فیض ہے کہ آپ زندہ ہیں سب معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں یہاں تک کہ کبھی تدبیر کے نتیجے میں موت ہو جاتی ہے۔“

’ایسے میں نشرہ کا اتنا کہنا تھا گویا ایک قیامت جو اب تک ٹھہری ہوئی تھی وہ آ ہی تو گئی ، میلوں دور تک ایک دلخراش آواز گونجتی چلی گئی نہیں نہیں نہیں۔ایسا نہیں ہو سکتا اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پہ رکھ لیے اور بے ہوش ہو کر بستر پر گر پڑی۔ چار پانچ گھنٹے بعدانہیں ہوش آیا اور پھر جیسے ان کی دنیا ہی بدل گئی ہو ... اس کی شاخ مژگاں پہ اشکوں کے گلاب مہکنے لگے ارے دلہن کو پتہ چل گیا ارے دلہن کو خبر ہو گئی... سارے گھر میں جیسے پھر سے ایک تازہ ہنگامہ برپا ہو گیا ...‘

ایسے میں نشرہ کا اتنا کہنا تھا گویا ایک قیامت جو اب تک ٹھہری ہوئی تھی وہ آ ہی تو گئی ، میلوں دور تک ایک دلخراش آواز گونجتی چلی گئی نہیں نہیں نہیں۔۔۔ایسا نہیں ہو سکتا اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پہ رکھ لیے اور بے ہوش ہو کر بستر پر گر پڑی۔۔۔ چار پانچ گھنٹے بعد انھیں ہوش آیا اور پھر جیسے ان کی دنیا ہی بدل گئی ہو۔۔۔ اس کی شاخ مژگاں پہ اشکوں کے گلاب مہکنے لگے ارے دلہن کو پتہ چل گیا ارے دلہن کو خبر ہو گئی۔۔۔ سارے گھر میں جیسے پھر سے ایک تازہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔۔۔ نشرہ کے ہاتھ پیر شل ہو چکے تھے وہ اب تک بے جان عذرا کے قریب ہی بیٹھی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ عذرا کے سارے غم کے اثرات رفتہ رفتہ نشرہ کے چہرے پر نمایاں ہو گئے ہیں اور قریب ہے کہ اس کی روح پرواز کر جائے آہستہ آہستہ نشرہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور ماضی کی یادیں اسے جھنجھوڑنے لگیں۔۔۔ ہا ہا ہا ارے شارب بھائی آپ بھی کمال کرتے ہیں ارے آیۃ الکرسی بھی بھلا کسی کو یاد نہیں ہو گی کیا یہ تو بچے بچے کو یاد ہے پھر آپ مجھ سے ہی سننے کی ضد کیوں کر رہے ہیں ارے نشرہ سنائیے تو صحیح سچ کہوں آپ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں کس طرح پڑھتی ہیں آپ آیۃ الکرسی ذرا میرے سامنے پڑھیے تو صحیح۔۔۔ شارب حوض علمیہ سے فارغ تھا فصاحت و بلاغت میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا غضب کی قاری تھی ان کی صلاحیت الفاظ کی تجسیم سے ماورٰی اپنے دامن میں بلاغت کے نمایاں جوہر اور فصاحت کے بہترین مرقعے رکھتی تھی۔ قرآن کی بیشتر سورہ انھیں حفظ تھی اب ایسے قاری قرآن کے آگے بھلا نشرہ کیا آیۃ الکرسی کی تلاوت کرتی ادھر ادھر کی باتیں کر کے دامن چھڑانا چاہتی مگر وہ بھی بڑے ضدی تھے۔نہیں نشرہ یوں نہیں پہلے سنائیے تب جا سکتی ہیں آپ گھر ورنہ اجازت نہیں ملے گی اور مجبوراً اسے سنانا پڑتا سنانے کے بعد اس کے ردعمل کا انتظار کرتی جو تسلی بخش ہوتا اور وہ تیزی سے گھر واپس آ جاتی ۔اس نے سنا تھا کہ وہ ایک سال سے اپنے آبائی وطن میں ہی رہ رہے ہیں کہ اب واپس مدرسے شادی کرنے کے بعد ہی جائیں گے ان کے لیے لڑکیاں تلاش کی جا رہی ہیں چچی جان آج کل ہر گاؤں ہر شہر کی خاک چھان رہی ہیں ایک دن تو یہاں تک ہوا کہ شارب بھائی نے ہنسی مذاق میں کہہ ہی دیا نشرہ قسم خدا کی آپ مجھ سے دو سال بڑی ہیں ورنہ ہم تو شادی آپ سے ہی کرتے اور پھر نشرہ کی اور شارب کی بول چال نہ جانے کتنے دنوں تک بند تھی آخر کار شارب کو ہی معافی مانگنی پڑی میری اچھی نشرہ ہم تو مذاق کر رہے تھے واللہ ہم نے ایسا خواب میں بھی نہیں سوچا ہمارے لیے محترم ہیں ہاں ایک بات ضرور کہوں گا شارب کو پھر شرارت سوجھی ہمارے نجم بھائی کے لیے بالکل درست ہیں دیکھیے ہم تو نجم بھائی سے آپ کا عقد

کروا کر رہیں گے بہت ہوگئی آپ کی پڑھائی لکھائی بس اب اور نہیں اب جایئے اس یوسف ذی جاہ نے آپ کو آزاد کیا۔

اپنی پر لطف اور دلجوئی بھری باتوں سے سب کے دل میں اتر جانے والے شارب بھائی کتنے سادہ تھے جبکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ جہاں علمی کمال ہو وہاں عمل سے تہی دامنی نہ سہی مگر عملی کوتاہیوں میں تو کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا مگر یہاں کچھ معاملہ برعکس تھا۔ جو ساری زندگی دوسروں کو ہنساتا رہا دوسروں کے دکھ درد کا ساتھی رہا وہ آج موت کی آغوش میں گم صم سو رہا ہے۔ کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی خاطر اپنی جان دے دیں شارب بھائی نے عذرا بجیا سے محبت کرنے کے بعد شادی نہیں کی تھی بلکہ شادی کرنے کے بعد محبت کی تھی اور ان ڈیڑھ مہینوں میں انھیں عذرا بجیا سے اتنی محبت ہوگئی کہ انھوں نے انھیں بچانے کی کوشش میں اپنی جان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بیشک وہ توصیف کرنے والوں کے توصیفی کلمات سے بالاتر تھے۔ ان کی شخصیت جامع تھی جس میں مختلف و متضاد صفات سمٹ کر جمع ہوگئے تھے اور تمام محاسن اخلاق اپنی پوری تابندگی کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ گویا ان کی زندگی کئی زندگیوں کا مجموعہ اور ہر زندگی صفت کمال کا وہ نادر مرقع تھی جس سے فضیلت کے بے داغ خدوخال ابھر کر سامنے آتے تھے اور جس کے ہر کمال پر نظریں جم کر رہ جاتی تھیں۔

اس نے بیتاب ہو کر آنکھیں بند کرلیں اس کے تصور میں شارب بھائی کا دائمی مسکن گردش کرنے لگا افسوس جو آج تک زمین کے دوش بدوش جیا کرتا تھا آج اس کا مسکن قبر ہے وہ بے چین ہوگئی ہائے رے دنیا کی بے ثباتی اور وہ گویا اس لحد کے مکین کو مخاطب کر کے کہنے لگی اے وحشت افزا گھروں، اجڑے مکانوں اور اندھیری قبروں کے رہنے والو! اک خاک نشینو! اے عالم غربت کے ساکنو اے تنہائی اور الجھن میں بسر کرنے والو تم تیز رو ہو جو ہم سے آگے بڑھ گئے یہ دنیا ایک ایسا گھر ہے جو بلاؤں میں گھری ہوئی اور فریب کاریوں میں شہرت یافتہ ہے اس کے حالات کبھی یکساں نہیں رہتے اور نہ اس میں فروکش کرنے والے صحیح وسالم رہ سکتے ہیں خوش گزرانی کی صورت ان میں قابل مذمت اور امن وسلامتی کا ان میں پتہ نہیں اس کے رہنے والے تیر اندازی کے ایسے نشانے ہیں جن پر دنیا اپنے تیر چلاتی رہتی ہے اور موت کے ذریعہ انھیں فنا کرتی رہتی ہے۔

جو پائدار نشانیوں والے تھے ان کی آوازیں خاموش ہوگئیں بدن گل سڑ گئے، انھوں نے مضبوط محلوں اور بچھی ہوئی مسندوں کو پتھروں اور چنی ہوئی سلوں اور پیوند زمین ہونے والی قبروں سے بدل لیا جن کے صحنوں کی بنیاد تباہی و ویرانی ہے اور مٹی ہی سے ان کی عمارتیں مضبوط کی گئی ہیں۔

خبردار دنیا داروں کی دنیا پرستی اور ان کی حرص وطمع جو تمھیں دکھائی

دیتی ہے وہ تمہیں فریب نہ دے۔

انسان ایک ایسے گھر میں ہے جو آخرت کا ساز و سامان مہیا کرنے کے لیے ہے اور اس کی منزل آخرت کی گزرگاہ ہے جس کا موت پیچھا کیے ہوئے ہے ہم وہی ہیں اور ہم لاکھ بھاگتے رہیں اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔

نشرہ آہستہ آہستہ واپس حال کی بیتابیوں میں لوٹ آئی اس نے پھر آہستہ سے آنکھیں بند کرلیں۔ عذرا کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔۔ رفتہ رفتہ دن گزرتے گئے ایک دن نشرہ نے سنا کہ عذرا بجیا کی شادی انہی کے جیٹھ نجم سے طے ہوگئی ہے جیسے چھن سے اس کے اندر کچھ ٹوٹ ہی تو گیا مگر اس نے اس سے اٹھنے والی آواز کو اپنے وجود میں ہی دفن کرلیا کسی نے اس کی کراہ تک نہیں سنی اور پھر رفتہ رفتہ وہ دن بھی آ گیا جب عذرا بجیا کی منگنی نجم سے ہونے والی تھی سارے گھر میں ایک شور شرابا تھا ایک ہنگامہ تھا ہر طرف عجیب و غریب صنعت کی لطیف نقش آرائی تھی۔ لوگ ایک ایسی دنیا میں محو تھے مانو وہاں بقا ہی بقا ہے فنا کا کوئی گزر نہیں اور زمانہ ان کے تعاقب میں اپنے تیر کا چلہ چڑھائے ہوئے ہے مستعد ہے جس کے تیر خطا نہیں ہوتے۔ وہ منگنی کی رسم کی ادائیگی کی تیاریوں میں مشغول ہوگئی۔

ایسے خوشگوار ماحول میں کسی کے سسکنے کی آواز نے عذرا کا دل دہلا کر رکھ دیا یہ نجم ہے ہاں یہ نجم ہے عذرا نے غور سے سنا اس نے ہمت کر کے نجم کے کمرے کی بے زبان دیواروں سے اپنے کان لگا دیے اور دونوں محو گفتگو ہوگئے اور اس دیوار کے پردہ سے اٹھنے والی شعاؤں نے گویا عذرا کا دامن جلا دیا اور نجم کی باتیں ایک کاری ضرب کی مانند عذرا کی روح میں سرایت کرتی چلی گئیں۔ نجم ماں کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح رو رہا تھا اور اس کے لب سرگوشیاں کر رہے تھے ''امی میری اچھی امی'' میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ آپ نے مجھ سے بغیر پوچھے کیسے طے کرلیا امی آپ تو جانتی ہیں میں بچپن سے نشرہ کو چاہتا ہوں حد سے سوا میں اس کے علاوہ کسی اور سے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتا اسی لیے میں نے آج تک شادی بھی نہیں کی امی آپ نے ایک بار مجھ سے پوچھا تو ہوتا آخر میری مرضی جاننے کی کوشش تو کی ہوتی امی مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں میں جی نہیں سکتا۔ امی اس غبار غم کے کف پا کی کج کلاہی نے مجھے برباد کر ڈالا مگر میں جانتا ہوں اس کے دل میں بھی میرے لیے جذبات ہیں۔ امی میں نے اس کی آنکھوں میں محبت کے ساغر موجیں مارتے ہوئے دیکھے ہیں۔

''امی آپ سمجھتی کیوں نہیں نشرہ کے بغیر میری زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی'' نجم اپنی امی سے محو گفتگو تھے اور چچی جان بت بنی یہ سب سن رہی تھیں۔ عذرا نے خود کو بمشکل سنبھالا گویا جگر میں درد کی سوفار توڑ دی گئی ہو اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس ہنگامے میں نشرہ کو تلاش کرنے لگی اس جشن طرب میں حلقہ اشکال کے درمیان کسی کو ڈھونڈھنا مشکل تھا بالآخر نشرہ مل ہی گئی دیکھا تو کیا دیکھا نشرہ کنگن بنانے میں مصروف ہے عذرا بڑے سلیقے سے نشرہ کے قریب آ کر بیٹھ گئی ''نشرہ میری بہن یہ تم کیا کر رہی ہو جس کنگن پر تمہارا حق ہے اسے میں کیسے قبول کرسکتی ہوں'' نشرہ کی نبضیں تھم سی گئیں ''نہیں عذرا بجیا اس کنگن پر ازل سے آپ کا حق ہے اور رہے گا میں کون ہوتی ہوں اسے پہننے والی نشرہ نے اپنا منہ بائیں جانب پھیر لیا'' تم تم نجم کی کہکشاں ہو جو اس کے آسمان محبت میں درخشاں ہے نشرہ میں یہ شادی نہیں کرسکتی۔ عذرا نے گویا اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا میری بہن اس وسعت زخم کی تاویل کی یہی صورت ہے''۔۔۔ ''نہیں ہرگز نہیں آپ کو یہ شادی کرنی ہی پڑے گی آپ کی گود میں ایک ننھی سی بچی ہے اس کی زندگی کا سوال ہے اس کے مستقبل کا سوال ہے میں ایک بچی کو بے سہارا کبھی نہیں کرسکتی کیوں کہ میں جانتی ہوں داغ یتیمی کیا ہوتا ہے اس کا غم اس کا کرب کیا ہوتا ہے اور آپ جس کے ہاتھوں کی مہندی بے رنگ ہونے سے پہلے زندگی بے رنگ ہوگئی ہو اب جبکہ اس کی حنا کا رنگ واپس آسکتا ہے میں اسے بے رنگ کر دوں آپ کی اتنی لمبی زندگی کسی سہارے کے بغیر کیسے گزرے گی۔ یہ کہتے کہتے نشرہ نے عذرا کو گلے سے لگا لیا۔ عذرا بجیا میں آپ کی آنکھوں میں اب کوئی آنسو نہیں دیکھنا چاہتی گویا اس نے گلوگرفتگی کے باوجود حنظل سے زیادہ تلخ گھونٹ برداشت کرلیے۔۔ ''نشرہ میں یہ شادی کیسے کرسکتی ہوں جبکہ میں یہ جانتی ہوں نجم تم سے محبت کرتے ہیں'' عذرا نے آہستہ سے کہا'' بجیا وہ کرتے ہیں میں نہیں''۔ ''عذرا بجیا نجم بھائی کی شادی ہوگی تو آپ سے اور مجھے یقین ہے آپ میری بات ضرور مانیں گی''۔ عذرا نے اسے گلے لگایا'' میری جان نشرہ نعمتوں کے زائل ہو جانے سے ڈرو کہ بے قابو ہو کر نکل جانے والی شئے کبھی واپس نہیں آتی سب سے بڑی ثروت عقل و دانش ہے اور سب سے بڑی ناداری حماقت و بے عقلی ہے'' نشرہ نے فوراً جواب دیا'' ہاں اور شاید یہ بھول گئیں کہ سب سے بڑا جوہر ذاتی حسن اخلاق ہے۔''

اسی اثنا میں نجم بھائی بھی نشرہ اور عذرا کے پاس ہی آ کر کھڑے ہوگئے'' عذرا عذرا میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں'' نجم نے بیتابانہ نگاہ عذرا پر ڈالی اس سے پہلے کہ نجم کچھ کہتے نشرہ نے آہستہ سے کہا'' مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے میں کسی بھی حرف ملامت سے گریز کرتے ہوئے اتنا کہوں گی کہ میں نے بھی صحبت جبرئیل میں زندگی نہیں گزاری مگر عذرا بجیا سے کچھ کہنے سے پہلے میری چند باتیں سن لیں میں نے آپ سے کبھی محبت نہیں

کی' اوراس نے ایک ہی آن میں نجم کی آنکھوں کے مناظرہ کی تبدیلی اور مواقف کے تغیر کو محسوس کیا۔

نشرہ نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا" مجھے امید ہے کہ آپ عذرا بجیا سے شادی کرکے بہت خوش رہیں گے یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اگر کوئی آپ سے حسن ظن رکھے تو آپ پر لازم ہے کہ آپ اس کے گمان کو سچا ثابت کریں"

نجم کی کشتۂ امید نگاہیں نشرہ کے غنچۂ لب پہ ٹھہر کر رہ گئیں "نشرہ میں نے وہ جام جو کبھی ان آنکھوں سے پیے تھے اب تک چشم میکش میں اس سبو کا خمار باقی ہے پھر فرط ندامت سے نجم کے جذبات کی موجوں میں کپکپی سی طاری ہوگئی۔ میں تمھیں کس طرح اپنی محبت کا یقین دلاؤں کہ مرے بدن پہ کوئی زخم معتبر نہیں نشرہ۔۔ سنیں نجم" دو ہی راستے ہیں آپ کے پاس یا تو غم وحزن کی حالت میں صبر کیجیے یا رنج واندوہ سے مرجائیے"۔

"اگر ایسا ہی ہے تو لو اپنے ہاتھوں سے میری گردن دبا دو تا کہ میں اس دنیا میں رہوں ہی نہ اور تیزی سے نشرہ کے ہاتھوں کو تھام کر اپنی گردن کی طرف لے آیا نشرہ نے گھبراہٹ میں اپنے ہاتھوں کو سمیٹ لیا" کیوں کیوں اب کیوں میرے قاتل کا ہاتھ شل ہوا جارہا ہے بتاؤ نشرہ"" نجم یاد رکھئے اس دنیا کی مسرت کی فریب کاریاں اوراس کی سیرابی کی تشنہ کامیاں بہت زیادہ ہیں۔"

نجم اپنے نصیب پہ سراپا پشیماں کھڑا سوچ رہا تھا کہ نشرہ کی اس بے رخی کی زد پہ آکر اس کا خشک گلو کیسے زندہ رہ گیا نشرہ نے ایک ہی ساعت میں وہ کنگن عذرا کو پہنا دیے اب بھی عذرا کے یقین کے ستون متزلزل تھے۔نشرہ نے اس کی کلائیاں چوم لیں اوراس کی آنکھیں یوں بھر آئیں گویا چشم خوش آب کی تمثیل ہوں۔عذرا نے فوراً اپنے ہاتھ کھینچ لیے نشرہ اگر ہفت اقلیم ان چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دیے جائیں تو بھی ایسا نہ کروں۔

نشرہ اس قدر آسانی سے ان ارمانوں کو غیروں کی آنکھوں کے حوالے کر دینا بہت مشکل ہوتا ہے جسے ہمیشہ سے خود کی آنکھوں میں سجایا ہو۔ اس یاد رفتگاں سے دامن چھڑانا کس قدر مشکل ہے جو اس رمز کو واشگاف کر سکے ایسا دیدہ ور یقیناً کوئی نہیں۔ یقیناً یہ شہر منافق حد درجہ جانسوز ہے" نشرہ نے منہ دوسری طرف کر لیا نجم نے ایک بار پھر نشرہ کو پر امید نظروں سے دیکھا" نشرہ کیا یہ صدائے نالۂ بے اختیار تمھارے دل میں ارتعاش نہیں اجاگر کرتے داد دیتا ہوں اس جسارت طرز سخن کی نہیں نشرہ اس لق ودق صحراؤں میں تمھارا وجود میرے لیے دلیل حیات ہے ایسا نہ کروں میں مرجاؤں گا۔"

نشرہ گویا ظاہری طور پر نجم کے وجود سے قطعاً لاتعلقی ظاہر کر رہی تھی "نجم تم جو سمجھو مگر مجھے یقین ہے بہترین عمل وہی ہے جس کے بجالانے میں ہمیں اپنے نفس کو مجبور کرنا پڑے مجھے اس عالم فانی میں سانس لینے والے بشر سے محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ میری محبت کا مرکز تو وہ ذات ہے جس کی محبت کو فنا نہیں۔اس کے بندھنوں کے لیے شکست وریخت نہیں۔ نہ اس کے حلقے کی کڑیاں الگ الگ ہو سکتی ہیں نہ اس کی بنیاد گر سکتی ہے نہ اس کی محبت کے ستون اپنی جگہ چھوڑ سکتے ہیں نہ اس کے سائبان کا درخت اکھڑ سکتا ہے۔ نہ اس کی مدت انسیت ختم ہو سکتی ہے نہ اس کے قوانین میں ظلم وجبر ہے۔ نہ اس کی الفت کی شاخیں کبھی کٹ سکتی ہیں نہ اس تک پہنچنے کی راہیں تنگ اور نہ اس کی آسانیاں دشوار ہیں نہ اس کے خلوص کے سفید وشفاف دامن پر بے مروتی اور نفرت کا سیاہ دھبہ ہے نہ اس کے ایثار کی استقامت میں پیچ وخم۔ نہ ہی اس کی قربانی کے چراغ گل ہوتے ہیں نہ اس کی خوشگواریوں میں تلخیوں کا گزر ہوتا ہے۔خدا کی محبت ایسا نور ہے جس کی قندیلیں کبھی گل نہیں ہوتیں جس میں تیرگی کا گزر نہیں ایسی دوا ہے جس سے کوئی مرض نہیں رہتا، ایسی رسی ہے کہ جس کے حلقے مضبوط ہیں جس میں راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی ایسی کرن ہے جس کی پھوٹ مدھم نہیں پڑتی وہ سراسر شفا ہے جو اس سے وابستہ ہو جائے۔اس کے لیے سرمایۂ عزت ہے جو اس کا بار اٹھائے وہ اس کا بوجھ بٹانے والی ہے" آہستہ آہستہ غموں کے نہ اٹھنے والے بوجھ سے اس کی آنکھیں بھر آئیں مگر اس نے یکا یک سارے کرب واندوہ ذہن سے جھٹک دیے اور مسکراتے ہوئے سوچنے لگی سر ساحل تشنہ رہ جانے کا بھی ایک الگ ہی لطف ہے۔

اور چاروں طرف حصار کرتی ہوئی وسعت حلقۂ زنجیر محبت ایک 'چھن' کی آواز کے ساتھ شکستہ ہوگئی۔ اور دوبارہ اس نے اس کی تمام آوازیں وجود کے تہ خانے میں حنوط کر دیں اوراچانک ہی وہ خود کو ایسے عالم میں پارہی تھی جہاں جذبۂ قربانی رکھنے والی بلند روحیں خوشنما فردوس کے جامے پہنے ہوئے پاکیزہ نفوس کے گرد چکر لگا رہی ہوں۔

□□□

**Dr.Masroor Soghra**
CM College
Quilaghat
Darbhanga-846004 (Bihar)

# نظمیں

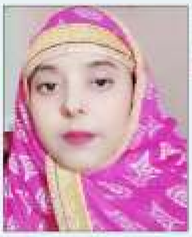

شیبا کوثر

## امید

میں! چیخ پڑتی ہوں
گھبرا کر بے تحاشہ
جب بھی سوچتی ہوں
میرے جسم وجاں کا کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟
کیا کچھ ہونے والا ہے
کیا کچھ کھونے والا ہے
کیا میرے جسم کا نقشہ
پھر بدلنے والا ہے۔۔۔۔۔۔؟
یا میرے جسم کی تراش
پھر سے ہونے والی ہے
میری جاں کھونے والی ہے
یا میرے زخم پھر سے
گہرے ہونے والے ہیں۔۔۔۔۔۔؟
اور مجھ کو یہ گہرے، بہت گہرے
درد میں ڈبونے والے ہیں
شاید مجھے پھر دکھ سہنا پڑے گا
اور چپ چاپ رہنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!

بہت مدت سے میں خاموش
وار سہتی رہتی تھی
جو بھی ہو ہمارے ساتھ
زمانے کے سنگ رہتی تھی
ظلم سہتی رہتی تھی
سخت موسم کے میں
فضا جو ہوتی بدرنگ کبھی
رہ جاتی تھی سہم کے میں
لیکن اب کے یہ کیا ہو گیا
دل میرا نہ جانے کہاں کھو گیا
بہت بے چین رہتی ہوں
جو ہو چپ چاپ سہتی ہوں
ایک ہی چیز رہ گئی ہے میری
اے "امید" بس امید ہے تیری۔۔۔۔!!!

# "دیا جلاؤ"

دیا جلاؤ!
کہ دیا جلانا ضروری ہے
اندھیرا ہے ہر گام پر
روشنی ضروری ہے
پھیلا ہوا ہے
سارے عالم پر
خوف و وحشت کی تاریکی!!
زندگی بے بس ہے
اور لاچار بہت
آفت بڑی ہے
پر امید بہت
یقین ہے پھر بھی
اپنے ہونے کا
احساس سب کو
ہر لمحہ کھونے کا
ایک عجیب وحشت ہے
کیا ہوگا، کب ہوگا
کیسے ہوگا۔۔۔۔؟

سوال بہت ہیں!!
لیکن کسی کو کچھ بھی تو
معلوم نہیں
ہاں
ایک "چراغ"
جو دور روشن ہے
امید کی لو
جہاں سے کچھ ہو کے آتی ہے
دیا جلاؤ
کہ دیا جلانا ضروری ہے
ضروری ہے، بہت
بہت ضروری ہے!!!

Sheeba Kausar
Moh: Brah batrah
Post: Arrah
Dist: Bhojpur-802301 (Bihar)

# نظمیں

شبانہ عشرت

## * کہاں ہے پیرہن میرا *

نہ رنگ وروپ
مرا
اور نہ پیرہن میرا
ہے دسترس میں
کسی اور کے بدن میرا
جہاں بھی دیکھو
تو
پرچھائیاں وجود کی ہیں
ہزار خانوں میں
بٹتا ہے ایک من میرا
نگاہ
روز بدلتی ہے آیئنے اپنے
تراش
لیتی ہے ہر
نئی نئی صورت
کہاں تلاش کروگے
کہیں نہیں ہوں میں
بس ایک روح
نہ ہو جس کا
پیرہن کوئی

## * میں خوشبو ہوں *

میں خوشبو ہوں
ہواؤں میں بسی
پھولوں میں لپٹی ہوں
مگر ممکن نہیں میرا کہیں محصور ہو جانا
کسی آنگن کی بیلوں میں
کہیں اونچی فصیلوں میں
نہیں رکتی، نہیں تھکتی
ہوا کے دوش اڑتی ہوں
ذرا سی دیر کو پھولوں کے دامن میں پناہ لے کر
لپٹ جاتی ہوں پل بھر کو کسی رنگین آنچل سے
پلٹ جاتی ہوں میں
پھر سے کسی جھونکے کی بانہوں میں
مری حسرت، مری خواہش جہاں میں پھیل جانے کی
بکھر جاؤں میں ہر دل میں محبت کی خوشی بن کر
نہ ہو رنگت اداسی کی
اتر جاؤں لہو میں پیار کی روشن کرن بن کر
میں خوشبو ہوں
بکھرنے دو مجھے ساری دشاؤں میں

Shabana Ishrat
C/O late Abdul Rahman
Milan House, Near Shadi Mahal
Dargah Road, Pathar ki Masjid
Patna-800006 (Bihar)

# لذیذ پکوان

## نوابی کباب

**اجزا:** چکن کا قیمہ آدھا کلو، چکن کیوب ایک عدد، پستے پچیس گرام (پسے ہوئے) بادام پچیس گرام (پسے ہوئے)، اخروٹ پچیس گرام (پسے ہوئے)، مرچ ایک کھانے کا چمچ (کٹی ہوئی) لہسن ادرک کا پیسٹ ایک کھانے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، بیسن تین سے چار کھانے کے چمچ، گرم مصالحہ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، ہری مرچ دو سے تین عدد (کٹی ہوئی) انڈا آدھا، پیاز ایک عدد (کٹا ہوا)، ہرا دھنیا دو کھانے کے چمچ، پودینہ دو کھانے کے چمچ، آمچور پاؤڈر ایک کھانے کا چمچ

تیل فرائنگ کے لیے

ایک پیالے میں تمام اجزاء کو ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔

اب اس میں مکسچر کے پیٹیس بنالیں۔

ایک پین میں تیل گرم کر کے پیٹیس کو شیلو فرائی کرلیں یہاں تک کہ سنہری رنگت آجائے۔

مزیدار نوابی کباب تیار ہیں، کیچپ یا دہی کے رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

## چنا انڈا پلاؤ

**اجزا:** چاول آدھا کلو، ابلے چنے دو کپ، ابلے انڈے چھ عدد، تیز پتے دو عدد، زیرہ ایک چائے کا چمچ، کالی مرچ ایک چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، ثابت گول مرچ چھ، ہری مرچیں چھ عدد، پودینہ ایک گھٹی، فرائی کیے ہو فرائز دو کپ، تیل آدھا کپ

ترکیب: تیل گرم کر کے اس میں زیرہ، کالی مرچ، تیز پتے اور ثابت گول مرچ ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔

جب خوشبو آ جائے تو ابلے چنے ڈالیں۔

اب اس میں کالی مرچ، نمک، پانی اور چاول ڈالیں۔

اس کے بعد جب دم پر آنے لگے تو اس میں ابلے انڈے، فرائی کیے ہو فرائز، ہری مرچیں اور پودینہ ڈال کر دم پر رکھ دیں۔

## بینگن ٹماٹر کری

اجزا: بینگن چار عدد، پیاز ایک عدد، تیل ایک چوتھائی کپ، لہسن کے جوئے چار سے پانچ عد (ٹماٹر چار عدد (اُبلے ہوئے)، پانی ایک کپ لال مرچ ایک کھانے کا چمچ (پسی ہوئی)، نمک حسب ذائقہ، تیز پتا ایک عدد، دار چینی ایک ٹکڑا، ہلدی ایک چائے کا چمچ، (زیرہ ایک چائے کا چمچ (پسا ہوا)، گرم مصالحہ آدھا چائے کا چمچ (پسا ہوا)، ہرا دھنیا حسب ضرورت، مٹر آدھی پیالی (اُبلے ہوئے)

ترکیب: پہلے بینگن کو چھوٹے کیوبز میں کاٹ لیں اور پیالے میں پانی بھر کر اس میں رکھ دیں۔

اب پیاز کو باریک کاٹ لیں۔

پھر کڑاہی میں تیل گرم کر کے پیاز اور لہسن کے جوئے شامل کر کے گولڈن براؤن کر لیں۔

اب اس میں ٹماٹر، بینگن کے کیوبز، ایک کپ پانی، پسی لال مرچ، نمک، تیز پتا، دار چینی، ہلدی، پسا زیرہ، پسا گرم مصالحہ اور ہرا دھنیا شامل کریں اور ڈھک کر پکنے دیں۔

آٹھ سے دس منٹ بعد ڈھکن ہٹا کر مٹر شامل کریں اور آنچ تیز کر کے پانی خشک کر لیں۔

مزے دار بینگن ٹماٹر کری تیار ہے۔

## مصالحہ بھرے کریلے

اجزا: کریلے چھ عدد، ہلدی ایک چائے کا چمچ (کریلوں پر لگانے کے لیے)، گڑ ایک کھانے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، تیل ایک پیالی، پیاز چار عدد (باریک کٹی ہوئی)، ہلدی ایک چائے کا چمچ، لال مرچ ایک کھانے کا چمچ (پسی ہوئی) کیری دو عدد، سونف آدھا کھانے کا چمچ، کلونجی ایک چائے کا چمچ، ہری مرچ چار عدد، کڑی پتے چھ سے سات عدد، ادرک لہسن کا پیسٹ ایک کھانے کا چمچ

ترکیب: پہلے کریلے چھیل کر چیرا لگائیں اور بیج نکال کر دھوئے بغیر ان پر ہلدی، تھوڑا سا گڑ اور تھوڑا نمک لگا کر بیس منٹ رکھیں۔

پھر دھو لیں۔

اس طرح کڑواہٹ ختم ہو جائے گی۔

اب دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز ہلکی گلابی کریں۔

پھر اس میں ہلدی، پسی لال مرچ، کیری، نمک، سونف، کلونجی اور ادرک لہسن کا پیسٹ شامل کر کے ہلکا سا بھونیں اور اُتار لیں۔

اب اسے ٹھنڈا کر کے کریلوں میں بھریں اور دھاگے سے باندھ کر فرائنگ پین میں شیلو فرائی کر لیں۔

اس کے بعد کریلے بچی ہوئی پیاز، گڑ، ہری مرچ، کڑی پتے اور نمک شامل کر کے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔

دس منٹ بعد مزے دار مصالحہ بھرے کریلے گرم گرم چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

□□□

(بحوالہ:khanapakana.com)

حسین فاروقی

# انفلوئنزا

موسم کیا تبدیل ہوتا ہے زکام بخار کی آمد ہوتی ہے۔ آئے دن ننھے میاں کو بخار تو منی بی بی نزلہ کا شکار۔ بیگم صاحبہ دردسر میں مبتلا تو خود صاحب فراش۔ تقریباً یہی کہانی ہر گھر کی ہوتی ہے۔ بات اگر یہیں تک رہ جائے تو شکر ادا کرنا چاہیے۔ عموماً ہوتا ایسا نہیں ہے۔ نزلہ کی ابتدا انفلوئنزا کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ یہ انفلوئنزا متفرق طور پر خال خال بھی ہوتی ہے اور وبا کی صورت بھی اختیار کرتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے وبا دو چار سال کے وقفہ سے ابھرتی تھی مگر ادھر چند سالوں سے ہر سال انفلوئنزا کا زور سننے میں آتا ہے۔

وبا اپنے پھیلاؤ کے حساب سے چھوٹی بھی ہوتی ہے اور بڑی بھی۔ چھوٹی وبا میں انفلوئنزا ایک آدھ ملک تک محدود رہتا ہے مگر بڑی وبا میں ساری دنیا لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ انفلوئنزا کی وبا سرعت سے پھیلتی ہے۔ مگر جس تیزی سے وبا آتی ہے اسی تیزی کے ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہے۔ عام طور پر وبا کی مدت چھ سے آٹھ ہفتہ ہوتی ہے اور اپنے ملک میں انفلوئنزا کی وبا موسم سرما میں پھیلتی ہے۔

## تاریخ

انفلوئنزا بیماری نہیں ہے۔ آج کل ہی نہیں بلکہ پچھلے وقتوں میں بھی لوگ بخار سے جاں بر نہیں ہو پاتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں وبائی بخاروں کا ذکر اکثر آیا ہے۔ چونکہ بخار انفلوئنزا کے علاوہ دوسری بیماریوں کا بھی جز ہے اس لیے بغیر تحقیق کے یہ مان لینا کہ عہد قدیم کا بخار انفلوئنزا ہوا کرتا تھا درست نہیں ہے۔ لیکن اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مذکورہ بخار انفلوئنزا ہی رہا ہو۔ توہم پرستی انسان کے خمیر میں ہے۔ آئے دن اس کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اکثر لوگ کام اہم ہے تو شبھ گھڑی معلوم کرنے کے فراق میں رہتے ہیں۔ یہ شبھ گھڑی سیاروں کی موجودگی اور ان کے اثرات کو دھیان میں رکھ کر نکالی جاتی ہے۔ کام بن جائے تو خوب۔ سیارے اچھے اور حساب درست سمجھا جاتا ہے ورنہ یہی سیارے نحس اور اندازوں کو غلط بتایا جاتا ہے۔ بیماریاں بھی چونکہ انسانی تباہی کی ذمہ دار ہیں اس لیے عہد گذشتہ میں نحس سیاروں کی موجودگی کو بیماریوں کی وجہ بتایا جاتا رہا ہے۔ اس کلیہ کی مثال لفظ انفلوئنزا بھی ہے جس کے معنی اثر کے ہوتے ہیں۔ دلانی نے 1358 میں اسی نظریہ کے تحت فلو کو انفلوئنزا کے نام سے یاد کیا اور فرمایا کہ ”جب نحس سیارے وجود میں آتے ہیں تو ان کے اثرات بد کی وجہ سے بخار پھیلتا ہے۔“ اگرچہ نویں صدی میں مورخوں نے عراق اور عرب میں انفلوئنزے کا وبائی شکل اختیار کرنا لکھا ہے۔ لیکن سولہویں صدی کی ابتدا میں یقینی طور پر وبا عالمگیر ہوئی۔ حالیہ چار صدیوں میں انفلوئنزا درجنوں مرتبہ وبائی شکل اختیار کر چکا ہے۔ صرف اٹھارہویں صدی میں یہ پانچ مرتبہ پھیل چکا ہے۔ انیسویں صدی کی وبا کا حال تو نہ پوچھیے۔ وبا کی ابتدا ہوئی چین میں اور دیکھتے دیکھتے ساری دنیا لپیٹ میں آ گئی۔ ایک اندازہ کے مطابق دنیا کی چالیس فی صدی آبادی مرض میں مبتلا ہوئی اور ایک فیصد جانیں گئیں۔ اس کے بعد 1918 کی وبا نے غضب ڈھایا۔ وبا کی شروعات بوسٹن سے ہوئی اور تھوڑے عرصے میں دنیا کی بڑی

آبادی اس کا شکار ہوگئی۔ تقریباً پچاس کروڑ آدمی انفلوئنزا کا شکار ہوئے اور اندازہ ہے کہ دو کروڑ موتیں ہوئیں۔ ہندوستان میں بیمار ہونے والوں کی تعداد نصف کروڑ کے قریب تھی۔ مرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ 1969 میں انفلوئنزا ہانگ کانگ سے پھیلا اور نہ کہ ہندوستان بلکہ پوری دنیا متاثر ہوئی۔ 1972 بھی وبا کا سال تھا۔ انھیں سب وجوہات کی بنا پر انفلوئنزا کو نئے طاعون کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور وبا کی جائے ابتدا کی بنیاد پر اس کو انگلستانی، اسپینی، ایشیائی انفلوئنزا بھی کہتے ہیں۔

**وائرس**

پاسچر کی بیکٹریا کی دریافت کے بعد سائنس دانوں کو نئی راہ ملی۔ ایک دو نہیں درجنوں بیماری کا ذمہ دار بیکٹریا کو ٹھہرایا گیا اور فیفر نے بھی اپنی کاوش کی بنیاد پر بیکٹریا کو انفلوئنزے کا ذمہ دار قرار دیا۔ لیکن یہ درست نہ تھا۔ حقیقت میں انفلوئنزے کا ذمہ دار وائرس ہوتے ہیں۔ یہ وائرس میکسو وائرس انفلوئنزی کہلاتے ہیں۔ سلٹر پہلے شخص تھے جنھوں نے 1918 میں وائرس اور انفلوئنزے کے تعلق پر روشنی ڈالی۔ اور پھر 1938 میں اسمتھ نے انفلوئنزے کے وائرس کی شناخت کی اور اس بات کو پایہ ثبوت کو پہنچایا کہ واقعی وائرس انفلوئنزا کے ذمہ دار ہیں۔

یہ وائرس بہت ہی چھوٹے اور گول ہوتے ہیں۔ وائرس اپنے اندر کیمیاوی مادہ رکھتے ہیں جسے آر۔ این۔ اے۔ کہتے ہیں۔ یہ آر۔ این۔ اے۔ شکل میں کنڈلی کھائے ہوئے سانپ کی طرح ہوتا ہے اور اس کے چاروں طرف پروٹین سے بنی ہوئی باریک جھلی ہوتی ہے۔ جھلی کی سطح سے کانٹے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔

انفلوئنزا وائرس کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ جیسے:

میکسو وائرس انفلوئنزی۔ اے۔

میکسو وائرس انفلوئنزی۔ بی۔

میکسو وائرس انفلوئنزی۔ سی

ان تینوں قسموں میں اے وائرس سب سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ انفلوئنزے کی زیادہ تر وبائی پن اسی کی کرم فرمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بیکٹریا کی طرح انفلوئنزا وائرس بھی اپنی نسل بڑی تیزی کے ساتھ بڑھاتے ہیں۔ یہ وائرس وقت کے ساتھ نہ کہ اپنی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ اپنے میں تبدیل کر کے نئے قسم کی نسل بھی پیدا کرتے ہیں۔

**تشخیص**

ابتدا: انفلوئنزے کی زد میں آدمی کا آنا کیا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ چند دنوں میں اچھا بھلا تندرست آدمی برسوں کا مریض معلوم پڑتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مریض پر بیزاری کا عالم بھی طاری ہوتا ہے اور احساس مرض آدمی کو کھائے جاتا ہے۔ سر اور ہاتھ پیر کے درد سے مریض پریشان ہوتا ہے۔ بخار تیز ہوتا ہے اور لرزہ بھی آتا ہے۔ ذہنی اور جسمانی تکلیف انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے اب مرض سے چھٹکارا نہ ملے گا۔

**شدت:** سر میں شدید درد ہوتا ہے۔ آنکھ کنپٹی میں بھی درد ہوتا ہے۔ تیز بخار 102-104 ڈگری فارن ہائٹ تک جا پہنچتا ہے۔ بخار یکساں نہیں ہوتا ہے کبھی تیز ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اتر جاتا ہے۔ ایک مرتبہ مکمل طریقے پر بخار کے اترنے کے بعد دوبارہ نہیں چڑھتا ہے۔ مرض سے چھٹکارا پانے کے بعد کمزوری باقی رہتی ہے۔ طاقت یکدم بحال نہیں ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ بہتر غذا اور قوت کی دواؤں کے استعمال سے آدمی بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے۔

عموماً انفلوئنزا کے ساتھ دوسری بیماریاں بھی آدھمکتی ہیں اس لیے مرض کی تشخیص کے وقت یہ بات ضرور دھیان میں رکھنی چاہیے کہ کہیں مریض انفلوئنزے کے ساتھ کسی دوسری بیماری جیسے نمونیہ وغیرہ کا شکار تو نہیں ہے۔

انفلوئنزا اپنی علامتوں اور کارگزاریوں کی بنا پر تین قسم کا ہوتا ہے۔

1۔ فیبرائل۔ حمی

2۔ ریسپریٹری۔ تنفّسی

3۔ میلگینٹ۔ خبیث۔

| حمی (فیبرائل) | تنفّسی (ریسپریٹری) | خبیث ( میلگینٹ ) |
| --- | --- | --- |
| بخار شدید ہوتا ہے۔ 102-104 ڈگری فارن ہائٹ تک جا پہنچتا ہے۔ بخار کی شدت تین سے لے کر آٹھ روز تک ہوتی ہے۔ ضعف ہوتا ہے۔ حلق سرخ ہوتا ہے۔ زبان پیلی ہوتی ہے۔ زکام خشک ہوتا ہے۔ پیشاب کا رنگ سرخ یا سرخی مائل ہوتا ہے اور کم ہوتا ہے۔ | اس قسم کے انفلوئنزا میں شروع میں وہی علامتیں ہوتی ہیں جو کہ فیبرائل انفلوئنزا میں، جیسے بخار، سر درد، جسم میں درد، بے چینی بھی ہوتی ہے اور کمزور بھی۔ گلا درد کرتا ہے۔ آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ زکام ہوتا ہے۔ ناک اور آنکھ سے پانی نکلتا رہتا ہے۔ آلات تنفس جلد مبتلائے | بخار شدید اور مہلک ہوتا ہے۔ ضعف ہوتا ہے۔ ابتدائی مرض میں غنودگی ہوتی ہے۔ بے چینی ہوتی ہے اور بے خوابی بھی۔ سخت سر درد ہوتا ہے۔ کمر اور جوڑوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ شدت ضعف سے حرکت قلب بند ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ نظام عصبی یا دماغ ماؤف |

مرض ہوتے ہیں۔ چھاتی میں درد ہوتا ہے۔ سانس جلد جلد آنے لگتی ہے۔ بلغم لیس دار ہوتا ہے اور اس کا اخراج بھی کم ہوتا ہے۔ اکثر نمونیہ ہوجایا کرتا ہے۔

ہو جایا کرتا ہے۔ غنودگی ہوتی ہے۔ مرض شدید ہے تو ہزیان ہونے لگتا ہے۔ بے خوابی ہوتی ہے۔ مختلف اعضائے جسم میں ورم ہو جاتا ہے جیسے ورم خصیہ، ورم حجاب القب (پری کارڈائی ٹس)۔ منجائٹس کن جنک ٹائی، ویٹس اور فالج بھی ہوجایا کرتا ہے۔

## عوارض ونتائج

انفلوئنزا ایسا مرض ہے جو نہ کہ خود انسان کو مریض بناتا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ دوسری بیماریوں کے لیے بھی راہ ہموار کرتا ہے۔ عموماً مریض کی حالت بگڑنا یا موت اسی وقت ہوتی ہے جب انفلوئنزا کے ساتھ دوسری بیماریاں بھی آدمی کو لگ جاتی ہیں۔ آخر یہ بیماریاں انفلوئنزے کی راہ کیوں دیکھتی ہیں۔ اس کا جواب ہم آپ کو دیتے ہیں۔ فضا میں بیکٹریا موجود ہوتے ہیں۔ ان میں مہلک اور غیر مہلک دونوں ہوتے ہیں۔ مہلک بیکٹیریا مختلف بیماریوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جیسے نمونیہ وغیرہ۔

عام حالات میں صحت مند جسم بیکٹیریا کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ لیکن انفلوئنزے کا شکار ہونے کے بعد جسم میں قوت مدافعت کی کمی اور پھیپھڑے سانس کی نلی کے مجروح سیلوں کی موجودگی بیکٹیریا کے جسم میں داخلہ آسان کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ پھیپھڑے اور سانس کی نلی کے زخمی سیلوں سے پیدا شدہ مادہ لعاب یا کف بیکٹیریا کے پھیپھڑوں کے اندرونی سطح پر پھیلنے، بڑھنے اور افزائش نسل کے لیے ضروری غذائی مادہ کا کام کرتا ہے۔ زندگی سانس کے آنے جانے کا نام ہے۔ یہ پھیپھڑے جو ہمارے جسم کی دھوکنیاں ہیں اور عمل تنفس کی ذمہ دار ہیں اگر متاثر ہو جائیں۔ بیمار قرار دی جائیں تو اپنا کیا حال ہوگا۔ اس کا اندازہ کرنا ہے تو نیچے کی سطور پر نظر ڈالیے۔

انفلوئنزے کی وجہ سے سانس کی نلی کے سیل مجروح ہو جاتے ہیں۔ پھول بھی جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہوا کے اندر باہر جانے میں دشواری ہوتی ہے۔ سانس لینا مشکل ہوتا ہے۔ بچے بوڑھے تو اکثر سانس لینے کی جدوجہد میں نڈھال پڑ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کے پھیپھڑے ضعیف العمری یا دوسری بیماریوں کی وجہ سے متاثر رہتے ہیں ان کے لیے انفلوئنزا کا ہونا موت کا پیغام ہوتا ہے۔ حاملہ عورتیں انفلوئنزے سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کم رکھتی ہیں۔ پھیپھڑے جلد اثر قبول کر لیتے ہیں

اور عمل تنفس کی کشاکش کبھی کبھی اسقاط حمل کا بھی سبب ہو جایا کرتی ہے۔ انفلوئنزے کی آمد نہ کہ نمونیہ بلکہ دوسری بیماریوں کے لیے بھی راہ ہموار کر دیتی ہے۔ جیسے ورم خصیہ (آرکائٹیس) ورم حجاب القلب (پیری کا ڈائٹیس) وغیرہ۔ یہ عوارض عموماً خبیث انفلوئنزا میں ہوتے ہیں۔ فیبر ائل انفلوئنزا اتنا خطرناک نہیں ہوتا ہے۔

**حفظ ماتقدم**

انفلوئنزے کا علاج اب تک نہیں دریافت کیا جا سکا ہے۔ اس لیے کوشش ہونی چاہیے کہ مرض سے جان بچی رہے۔ وبا اگر پھیل رہی ہے تو احتیاطی تدابیر کا خاص دھیان رکھنا چاہیے تاکہ بیماری سے بچا جا سکے۔ انفلوئنزا تندرست و ناتواں، بچہ، جوان، بوڑھے کسی کو بھی نہیں بخشتا ہے۔ اس لیے احتیاط ہر عمر اور صحت والوں کے لیے ضروری ہے۔ آپ کبھی بھی اس وہم وگمان میں نہ رہیں کہ توانا تندرست ہونا کافی ہے۔ انفلوئنزے سے بچنے کے لیے انفلوئنزا وائرس سے آلودہ فضا، مریض کی قربت اور استعمال کی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے اور ان ساری تدابیر کو بروئے کار لانا چاہیے جو کہ اور دوسری چھوت کی بیماریوں کے لیے بتائی گئی ہیں۔ چونکہ ہوا بھی ذریعہ ہے مرض کے پھیلانے کا اس لیے انفلوئنزے سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر کافی نہیں ہوتی ہیں۔ آپ اپنے کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں ناکامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔ پھیپھڑے انفلوئنزے میں اکثر متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بیماری سے بچنے کے لیے وہ ساری کوششیں ضروری ہوتی ہیں جو کہ نظام تنفس کو بہتر حالت میں رکھ سکیں۔

انفلوئنزے سے بچنے کے لیے کھلی فضا میں رہنا اور رات میں کھڑکیاں کھول کر سونا مفید ہوتا ہے۔ کمرہ اگر رات میں سرد ہو جاتا ہے تو اوڑھنے کا انتظام رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جسم کو سردی سے بچانا ضروری ہوتا ہے۔ یوکلپٹس آئل کو رومال میں لگا لینے اور وقتاً فوقتاً سونگھتے رہنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ دار چینی کے ایک ٹکڑے کو منہ میں رکھ کر چوئنگم کی طرح سوچتے رہنے سے اعضائے تنفس بہتر حالت میں رہتے ہیں۔ پوٹیشیم پرمیگنیٹ کے سلوشن سے ناک کو دھوتے رہنا چاہیے۔ وبا کے زمانہ میں آئس کریم، برف کے ٹھنڈے پانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ٹھنڈے پانی سے گلا خراب ہوتا ہے اور انفلوئنزے کے امکانات بڑھتے ہیں۔

**علاج اور معالجہ**

مریض کو آرام سے بستر پر لٹائے رکھیے۔ بخار کی حالت میں گھومنے پھرنے نہ دیجیے۔ بخار اگر اتر گیا ہے تو آرام دہ کرسی پر مریض کو بٹھائیے۔ دل بہلانے کی کوشش کیجیے۔ مریض درد کی شکایت کرتا ہے تو ایسپرین یا اسی قسم کی دوسری دوائیں دیجیے اور اگر درد شدت اختیار کر گیا ہے تو نیم گرم پانی میں پیر کو پنڈلیوں تک پانچ دس منٹ ڈبوئے رکھیے۔ اور پھر خشک کر کے چادر یا کمبل میں لپیٹ دیجیے فائدہ ہوگا۔ مریض کو کھلے ہوادار کمرے میں رکھیے اور ساتھ ہی ساتھ ٹھنڈ سے بچائیے۔ غذا کی طرف دھیان دیجیے۔ زود ہضم چیزوں کا استعمال کرائیے۔ جیسے آش جو، ساگودانہ، مونگ کی دال وغیرہ۔ انفلوئنزے میں غذا سے پرہیز کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن وہ غذائیں جو کہ ثقیل ہوتی ہیں مناسب نہیں رہتی ہیں۔ مریض کو رقیق چیزیں جیسے چائے دودھ وغیرہ ضرور دینا چاہیے۔ انفلوئنزا اگر بگڑ گیا ہے

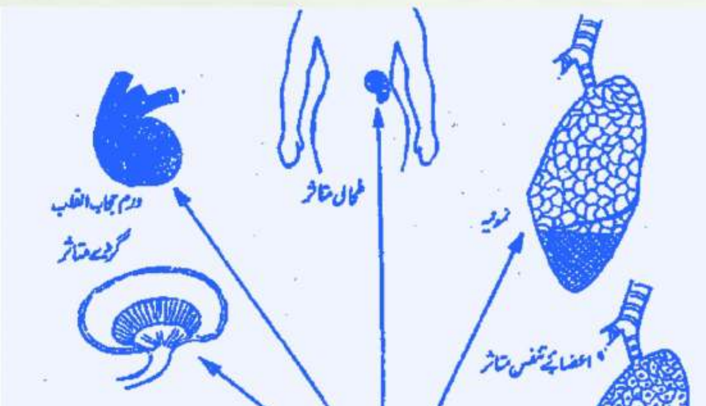


انفلوئنزا کے باعث پیدا شدہ عوارض

اور پھیپھڑے متاثر ہو رہے ہیں تو انٹی بائٹک کا سہارا لینے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ عام حالتوں میں ان دواؤں کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ صرف کف مکسچر بخار اتارنے والی اور درد کم کرنے والی دوائیں کافی ہوتی ہیں۔ انفلوئنزے کا جب کبھی آپ شکار ہوں تو ڈاکٹر سے مشورہ لینا نہ بھولیے۔

**(ماخوذ: چند عام بیماریاں، حسین فاروقی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، تیسرا ایڈیشن، 1993)**

□□□

# حسن کی نگہداشت

**ذرا سا بیکنگ سوڈا بتائے گئے طریقے سے چہرے پر لگائیں۔ایسا کمال کانسخہ جس کے نتائج دیکھنے کے بعد آپ حیران رہ جائیں گے**

خوبصورت دکھنا خواتین کا حق ہے اور اس کے لیے آپ کچھ نہ کچھ حربے استعمال کرتی رہتی ہیں۔ایک نظر کچن میں موجود بیکنگ سوڈے پر ہی ڈال لیں کہ یہ آپ کے چہرے کی خوبصوتی کو نکھارنے میں کتنا مفید ہے جانیں:

**1۔ایکنی کے لیے:** بیکنگ سوڈا ایکنی کو کنٹرول کرنے میں آپ کی مدد کرسکتا ہے اس کے لیے آپ کو چاہیے شہد دو کھانے کے چمچ ،بیکنگ سوڈا ایک کھانے کا چمچ ،ان دونوں کو ملا کر پیسٹ بنائیں اور چہرے پر لگا کر بیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں اور نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔

**2۔سن برن سے تحفظ:** سورج کی تپش سے جھلس جانے والی جلد کی رونق بحال کرنے کے لیے آپ ایک بالٹی ٹھنڈے پانی میں ۵ کھانے کے چمچ بیکنگ سوڈا شامل کرلیں اور اس سے نہائیں اس کو چہرے پر لگائیں اور خشک ہونے پر سادہ پانی سے دھولیں۔

**3۔جلن اور خارش کے لیے:** اگر گرمی میں آپ کی جلد پر بھی جلن اور خارش ہوتی ہے تو آپ بیکنگ سوڈے کو پانی اور ٹھنڈے دودھ میں حل کر کے چہرے پر لگائیں اس سے ٹھنڈک بھی ہوگی اور خارش میں بھی کمی آجائے گی۔

**4۔رنگت کے لیے:** مکمل رنگ گورا یقینی طور پر نہیں ہوسکتا لیکن کسی حد تک جلد کی رنگت کو نکھارنے کے لیے آپ ایک چمچ بیکنگ سوڈا، لیموں کا عرق اور 4 سے 5 قطرے زیتون کا تیل ملا کر پیسٹ بنالیں اور پانچ منٹ تک چہرے پر لگا رہنے دیں اور ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔

**5۔داغ دھبے اور نشانات:** بیکنگ سوڈا اینٹی سیپٹک خصوصیات رکھتا ہے اس کو لگانے سے نہ صرف نشانات کنٹرول میں آتے ہیں بلکہ اسکن کی پی۔ایچ بھی بیلنس ہوتی ہے۔ بیکنگ سوڈا اور پانی ملا کر ایک پیسٹ بنا لیں اب اسے چہرے کی متاثرہ جگہ پر بیس منٹ لگا رہنے دیں اور ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔

**بالوں میں پیاز کا تیل لگانا کیوں ضروری ہے؟ جانیں قیمتی نسخہ**

بالوں کا خوبصورت، لچکدار، لمبا اور گھنا ہونا خواتین کی بڑی خواہش ہوتی ہے اور وہ یہ چاہتی ہیں کہ ان کے بال کسی اپسرا سے کم نظر نہ آئیں مگر حسین بالوں کی خواہش کم ہی خواتین کی پوری ہوتی ہے کیونکہ یہ ایک قدرتی حسن بھی ہے اور آج کل غذاؤں کے متواتر نہ ہونے کی وجہ سے بھی بال گرنے لگتے ہیں لیکن اگر قدرتی طریقوں کا استعمال کیا جائے تو

بال نہ ہی خراب ہوں گے اور نہ ان پر کسی قسم کے سائیڈ افیکٹ پڑیں گے۔ پیاز کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ بالوں کی نشوونما اور ان کو بڑھانے کے لیے کس قدر مفید ہے لیکن پیاز کا تیل استعمال کر کے آپ اپنے بالوں کو کم ہی وقت میں زیادہ بھی بڑھا سکتے ہیں اگر کوئی بھی جلد کے مسائل نہ ہوں تو۔ چلیں بتاتے ہیں آپ کس طرح پیاز کا تیل گھر میں بنا کر اپنے بالوں میں جان ڈال سکتی ہیں۔

**نسخہ:**

چار پیاز کی گنٹھیوں کو چھیل کر بارک کاٹ لیں۔

ایک پتیلی میں ناریل کا تیل گرم کریں۔

اور پھر اس میں کٹی ہوئی پیاز ڈال کر خوب پکائیں۔

ابال آنے پر چولہا بند کر دیں۔

اس کو ٹھنڈا ہونے دیں۔

اب اس کو اپنے بالوں میں عام تیل کی طرح استعمال کر لیں۔

کوشش کریں کہ ہفتے میں دو مرتبہ اس کا استعمال لازمی کریں۔

چاہیں تو رات کو لگا کر سو جائیں اور صبح اٹھ کر سر دھولیں۔

## قدرتی اشیا سے تیار کردہ یہ ایک گولی روزانہ کھائیں کسی کریم کی ضرورت نہیں پڑے گی

کریموں کا استعمال بہت کر لیا کب تک لگائیں گی کریمیں یہی بات آپ بھی سوچتی ہوں گی جب رنگ گورا ہونے کی ہر کریم لگالی ہو اور فائدہ کچھ نہ ملا ہو کیونکہ کریم لگانا چھوڑ دیا جائے تو پھر رنگ کالا ہو جاتا ہے۔ لیکن اب جان چھڑائیں اپنی ان کریموں سے بغیر کسی نقصان کے گھر کی بنی ہوئی اسکن وائٹننگ کی گولیاں تیار کر کے کھائیں فرق آپ خود محسوس کریں گی۔

**ٹپ:**

☆ چھ باداموں کو اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں اور ان کو بلینڈر میں ڈال کر اچھی طرح باریک پیس لیں کہ پاؤڈر تیار ہو جائے۔ اس کے بعد تین چھوٹی الائچیوں اور سونف کو بھی دھو کر خشک کر لیں اور اس کو بھی پیس لیں۔

☆ مصری کا ایک چھوٹا ٹکڑا کوٹ کر پیس لیں اور بلینڈر میں ڈال کر پاؤڈر بنا لیں۔

☆ ان تمام چیزوں کو ایک پیالی میں ڈال لیں اور اس میں تین چمچ پاؤڈر والا خشک دودھ اور چار چمچ عرقِ گلاب ڈال لیں کہ سخت سا پیسٹ تیار ہو جائے۔

☆ پھر اس کو کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیں تاکہ مزید خشک ہو جائے اور اس کی گولیاں بنا کر رکھ لیں۔

☆ دن میں کسی بھی وقت ان گولیوں کو ایک گلاس دودھ یا پانی کے ساتھ استعمال کر لیں۔

☆ یہ گولیاں قدرتی چیزوں سے تیار کردہ ہیں ان کا کوئی سائیڈ افیکٹ نہیں ہوگا اور اس کے استعمال سے آپ کی رنگت بھی صاف ہو جائے گی اور چہرے کے تمام داغ دھبے دور ہوں گے اور ایکنی کے نشانات بھی ختم ہونے لگیں گے۔

(بحوالہ: hamariweb.com)

□□□

# تاثرات: نگر نگر سے

ماہنامہ ''خواتین دنیا'' جولائی 2020 ویب سائٹ سے موصول ہوا۔ شمارے کا پہلا مضمون حقانی القاسمی صاحب کا ''مقدس دیوانگی کی مثال میرا بائی'' بہت پسند آیا۔ کرشن بھکتی کے لیے مشہور میرا بائی جنھوں نے اپنی پوری زندگی کرشن کی محبت میں بسر کی۔ ان کی شاعری میں صرف اور صرف کرشن جی سے عقیدت اور محبت کے جذبات نظر آتے ہیں۔ کرشن بھکتی ہی میرا بائی کی زندگی کا حاصل تھا۔ جیسا کہ مضمون میں میرا بائی کی شاعری سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ میرا بائی اس وقت سے ہی کرشن کی محبت میں سرشار ہوگئی تھیں جب ان کی عمر محض چار برس تھی۔ ماں نے کرشن کنہیا کی مورتی کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا کہ تمھارا دولھا یہ ہے۔ تب سے میرا بائی نے ہمیشہ کے لیے کرشن کو ہی اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ مذکورہ مضمون بہت عمدہ ہے۔

دوسرا مضمون محمد دانش غنی کا ''بانو سرتاج کی کہانیاں'' ہے۔ عنوان دیکھ کر ایسا لگا کہ بانو سرتاج کے افسانوں پر بھی گفتگو کی گئی ہوگی لیکن مضمون میں صرف ان کی بچوں پر لکھی گئی کہانیوں پر ہی روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ بانو سرتاج نے عورتوں کے مسائل پر بھی کئی بہترین کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ مثلاً ''بھیگی ہوئی عورت''، ''صلیب پر لٹکی عورت''، ''دو کوڑی کی عورت''، ''دھندے والی عورت''، ''بدلی ہوئی لڑکی''، ''ننگی ٹانگوں والی عورت'' اور ''عورت'' وغیرہ۔ ان کہانیوں میں عورتوں کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ عنوان کے ساتھ ہی (بچوں کی کہانیاں) کا اضافہ کردیا جاتا۔

شمارے میں ایک بہت ہی اہم مضمون محمد عامل بدایونی کا ''تانیثیت: معنی مفہوم اور ضرورت'' پڑھنے کو ملا۔ مضمون میں تانیثیت کی تحریک و تاریخ کو بڑی عمدگی سے سمیٹا گیا ہے۔ انھوں نے تانیثیت کے معنی اور مفہوم پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مضمون میں مغربی مفکرین کی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ عامل صاحب نے اس مضمون میں اس بات پر توجہ صرف کی ہے کہ خواتین کی بیداری کی مہم کا آغاز کن کن وجوہات کی بنا پر ہوا اور اس کی ضرورت کیوں پڑی۔ انھوں نے مضمون میں کئی عمدہ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ مضمون میں خاص طور سے انگریزی کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے مضمون نگار کے مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مضمون طویل ہے مگر اس میں ہندوستانی خواتین مصنفین کا ذکر جس طرح سے آخر میں آیا ہے اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مضمون کا دوسرا حصہ جلد ہی شائع کیا جائے گا جس میں ہندوستانی خاتون مصنفین کی تحریروں پر اور تحریکوں پر مکمل گفتگو کی جائے گی۔ یہ مضمون تانیثیت کے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے بہترین نمونۂ راہ ہے۔ معلومات افروز عمدہ مضمون کے لیے مبارک باد۔

**ظفر الاسلام**، کریم الدین پور، گھوسی مؤ، یو۔ پی

جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔ ’خواتین دنیا‘ برصغیر ہند کا منفرد رسالہ ہے جو رنگین و معلوماتی مقالات وتخلیقات کا خزانہ ہے۔

’مشعل‘ میں مدیر اعلیٰ کی بات قابل غور اور قابل عمل ہے۔ شخصیت پر منحصر مضمون ’مقدس دیوانگی کی مثال: میرا بائی‘ پُر مغز ہے۔ یہ مضمون دیوانگی کی ایک اور شخصیت اکا مہا دیوی کی یاد دلاتا ہے۔ جو کنڑ ادب کی پہلی شاعرہ مانی جاتی ہیں۔ وہ بھی میرا بائی کی طرح چنا ملیکا رجنا کے عشق میں مبتلا تھیں۔ انھوں نے اپنی محبت کا اظہار کنڑ کی مقبول صنف شاعری ’وچن‘ کے ذریعہ کیا ہے۔ جہانِ نسواں کے چھ مضامین دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ پرتیبھا رائے اُڑیا ادب کی گیان پیٹھ انعام یافتہ ادیبہ ہیں۔ ’پرتیبھا رائے کے منتخب اڑیا افسانے‘ مضمون اُڑیا ادب کی عکاسی کررہا ہے۔ اسی کے ساتھ بانو سرتاج کی کہانیاں، تانیثیت: معنی ومفہوم اور ضرورت، مہرالنساء پرویز کی کہانیوں میں نسائی مسائل کی عکاسی، اردو کی خواتین افسانہ نگار، غربت کی نسواں کاری: ہندوستانی تناظر میں، عمدہ مضامین ہیں۔

دو کہانیاں ’پناہ‘ اور ’بھوک‘ کہانی کاروں کی بہترین کوشش ہے۔ ڈاکٹر شاذیہ کمال کی نظم ’یہ کسی نے سوچا نہیں تھا‘ بہت خوب ہے۔ لذیذ پکوان خواتین کے پکوان کا ذائقہ بڑھاتا ہے۔ یہ رسالہ خواتین کی ’صحت وحسن‘ کی نگرانی میں مفید وکارآمد معلومات فراہم کرتا ہے۔

’خواتین دنیا‘ خواتین کے ذہن کی گرہیں کھول کر ان میں پوشیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں کوشاں ہے اور ان کی ہمت افزائی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ دعا ہے کہ یہ رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین

**زلیخا چاند**، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو وفارسی، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

جولائی 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق بہت دیدہ زیب ہے۔ مشعل کے تحت دیا گیا اداریہ توجہ کا طالب ہے۔ آج ہم جس عالمی وبا سے دوچار ہیں اس کا سدباب ابھی مشکل ہے۔ مدیر اعلیٰ کی یہ رائے اس ضمن میں اہمیت کی حامل ہے ’کورونا کے بحران سے ایک نیا ادب سامنے آئے گا جو ادب کو نئے سرے سے سمجھنے میں ہماری مدد کرے گا۔ اس سے ایک نیا طرز فکر بھی پیدا ہوگا جو نوجوان نسل کو بہت متاثر کرے گا۔ یہ وبا ہمارے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ ہر کوئی اس صورت حال سے باہر نکلنے کے لیے پرعزم ہے اور اپنے اپنے طور پر اس سے بچاؤ کی عملی تدابیر بھی جاری ہیں‘ بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کورونا کے بعد ادب میں نئی تبدیلیاں آئیں گی اور اس عالمی وبا کا اثر ہمیں ادب پر بھی دیکھنے کو ملے گا۔

حقانی القاسمی صاحب کا مضمون میرا بائی کے حوالے سے ہے جس میں انھوں نے میرا بائی کی عقیدت کا بیان کیا ہے۔ میرا بائی کرشن کی دیوانی تھیں اور ان کی محبت میں انھوں نے اپنا گھر بار سب چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک شہزادی تھیں لیکن انھوں نے محلوں کی زندگی کو چھوڑ کر ویراگیہ کو اپنایا تھا۔ کرشن کے پریم میں میرا اتنی دیوانی ہو چکی تھیں کہ ان کو چاروں طرف کرشن کی صورت کے علاوہ کچھ اور نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میرا بائی ہمیشہ گردھر کے پریم میں دنیا سے بے خبر کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ ان کا دل کرشن کے لیے ہمیشہ بے چین رہتا تھا۔ ان کو ہر شے میں کرشن کا ہی جلوہ نظر آتا تھا۔ وہ ہر وقت کرشن جی کی مورتی کے سامنے بیٹھ کر بھجن گاتیں تھیں، گیت گاتی تھیں اور عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ مضمون نگار کی یہ رائے کہ ”میرا بائی اپنے وجود میں کرشن کے ارتعاشات (Vibrations) کو محسوس کرتی رہیں اور انھی ارتعاشات کو اظہار کی شکل عطا کی۔ میرا بائی کے نغموں میں کرشن کنہیا کی بانسری کی مقناطیسی آواز ملتی ہے، اسی اظہار کی مقناطیسیت ہے کہ میرا بائی کے مضمون نے ابدیت حاصل کر لی کیونکہ میرا کی تخلیق میں شیرینی، سادگی اور شدت ہے جو جمالیاتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کی حامل ہے“۔ میرا بائی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ کرشن جی کی محبت میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی اس اہم شاعرہ کو رہتی دنیا تک ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ’خواتین دنیا‘ کی کامیابی کے لیے دعا گوں ہوں۔

**شبانہ نسیم**، الہ آباد، یوپی

جولائی 2020 کا شمارہ نظر سے گزرا۔ مشمولات پر نظر پڑی۔ شخصیت کے ذیل میں میرا بائی کا مضمون بہت عمدہ ہے۔ مضمون نگار نے میرا بائی کی شخصیت کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ شاعرات کے منتخب اشعار بھی لاجواب ہیں۔ مہرالنساء پرویز کی کہانیوں میں نسائی مسائل کی عکاسی، اردو کی خواتین افسانہ نگار اور غربت کی نسواں کاری: ہندوستانی تناظر میں لائق توجہ مضمون ہیں۔ علاوہ ازیں افسانوں میں ’بھوک‘ اور ’پناہ‘ دنوں ہی افسانے عمدہ اور لاجواب ہیں۔ حسن سخن کے تحت ڈاکٹر شبنم عشائی، ڈاکٹر شاذیہ کمال اور ندا کاظمی کی نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شبنم عشائی صاحبہ کی دونوں نظمیں بہت پسند آئیں۔ رسالے کے دیگر کالم بھی بہت خوب ہیں۔

**راحت بیگم**، سنبھل، مرادآباد، یوپی

□□□

## یوپی ایس سی میں تیسری رینک حاصل کرنے والی پرتبھا ورما

سنگھ لوک سیوا آیوگ (یو پی ایس سی) نے سول سیوا پریکشا 2019 کا فائنل رزلٹ جاری کر دیا ہے۔ اتر پردیش کی پرتبھا ورما نے یو پی ایس سی امتحان 2019 میں تیسری رینک حاصل کی ہے۔ خواتین میں وہ پہلی جگہ پر ہیں۔ انھوں نے ملک کے سب سے مشکل امتحان میں تیسری رینک حاصل کی ہے۔ آئی اے ایس میں منتخب ہونے کے بعد انھوں نے خواتین کو بااختیار بنانے اور تعلیم کے میدان میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

پرتبھا ورما نے انڈین ریونیو سروس کو جوائن کر رکھا تھا، لیکنا امتحان کی تیاری کے لیے انھوں نے چھٹی لے لی تھی۔ سلطانپور کی رہنے والی پرتبھا ورما کا کہنا ہے میں نے جو بھی پایا اس سے میں خوش ہوں، مجھے یقین تھا کہ میں اچھا کروں گی، لیکن میں تیسری رینک پاؤں گی، اس کی بالکل امید نہیں تھی۔ پرتبھا نے فزکس کو اپنا آپشنل سبجیکٹ لیا تھا۔

پرتبھا نے آئی۔آئی۔ٹی دہلی سے 2014 میں گریجویٹ کیا۔

انھوں نے 2 سال تک ایک پرائیویٹ فرم میں ایکسپرینس کے لیے نوکری کی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہمیشہ سے ہی ایک سول سروینٹ بننا چاہتی تھیں، اس لیے انھوں نے یو پی ایس سی کی تیاری شروع کر دی۔ انھوں نے بتایا کہ پچھلے سال ان کی 489 رینک آئی تھی، اس کے بعد انھوں نے اپنی کمزوریوں پر محنت کی۔

پرتبھا کے والد سونش ورما سرکاری انٹر میڈیٹ کالج سے کچھ ہی مہینے پہلے انگریزی ٹیچر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ہیں، وہیں ان کی ماں اوشا ورما سرکاری اسکول سلطانپور میں ہیڈ ٹیچر ہیں۔

پرتبھا نے بتایا کہ ان کی بڑی بہن پرینکا ڈاکٹر ہیں، ان کے دو بھائی ہیں ایک پرائیویٹ سیکٹر کمپنی میں نوکری کرتا ہے اور چھوٹا بھائی پڑھ رہا ہے۔

(4 اگست 2020، لائیو ہندوستان ڈاٹ کام)

## کشمیر کی نادیہ بیگ نے یو پی ایس سی میں کامیابی حاصل کی

سال 2019 کے یونین پبلک سروس کمیشن کے تحت منعقد کیے گئے مسابقتی امتحانات یعنی یو پی ایس سی امتحانات کے نتائج سامنے آئے ہیں جس میں ملک کے ساتھ ساتھ جموں کشمیر سے بھی ایک درجن سے زائد امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ وہیں، سرحدی علاقے کپوارہ ضلع سے تعلق رکھنے والے دو امیدواروں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ ان میں سے ایک خاتون امیدوار بھی شامل ہیں۔ پنجوہ کپوارہ سے تعلق رکھنے والی نادیہ بیگ نے بھی یو پی ایس سی امتحانات میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

مذکورہ امیدوار کے والد اور والدہ دونوں پیشے سے استاد ہیں جبکہ اس کی دو بہنیں ایک سال قبل ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ اس موقع پر نادیہ بیگ نے نیوز ایٹین کے ساتھ بات کرتے ہوئے اپنے تعلیمی سفر کے بارے میں بات کی اور کہا کہ ان کی ابتدائی تعلیم آبائی علاقے میں ہی ہوئی ہے اور دسویں جماعت تک وہ ویلگام میں ایک مقامی اسکول میں تعلیم حاصل کرتی رہیں جبکہ اس کے بعد مقامی ہائی سیکنڈری میں ہی انھوں نے بارہویں جماعت کا امتحان پاس کیا جس کے بعد گریجویشن جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں مکمل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے یو پی ایس سی امتحانات میں قسمت آزمائی کی اور پہلی مرتبہ وہ پریلمز میں ناکام ہوئیں جس کے بعد دوسری مرتبہ آج وہ یہ امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔

(5 اگست 2020، نیوز 18، جموں کشمیر)

□□□

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## جزیرہ نہیں ہوں میں

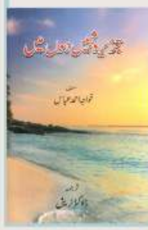

مصنف: خواجہ احمد عباس

ترجمہ: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 669، قیمت: 300 روپے

## رامپور کے فارسی گوشعرا

مولفہ: ساجدہ شیروانی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 290

قیمت: 160 روپے

## بابرنامہ

مصنف: ظہیرالدین محمد بابر

چھٹی طباعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 25 روپے

## کلیم عاجز

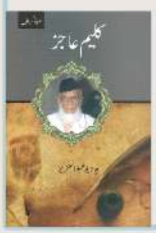


مصنف: جاوید عبدالعزیز

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 124

قیمت: 80 روپے

## قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون

اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 20

قیمت: 20 روپے

## لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

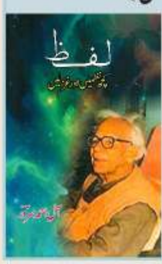


مصنف: آل احمد سرور

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 95

قیمت: 70 روپے

## صحت الفاظ

مصنف: سید بدرالحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

## کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 30

قیمت: 35 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

**Mahnama Khawateen Duniya Monthly September 2020, Vol. 4, Issue: 9 RNI. No. DELURD/2017/74026**
**ISSN 2581-4826**
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

## اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025